رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

REGD. N. A 466

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ

قیمت فی کاپی ۱۰ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان

آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی

انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی بہ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو انسانیتِ کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشاء اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات

کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ہارون۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون سامری۔ علم غیب۔ دعا۔ توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نورِ محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۴۶ صفحات کاغذ سفید دبیز۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔ اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت

چار روپیہ

علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالاتِ ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت

پانچ روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہو گا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دل کش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی مدد کی، اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ

علاوہ محصول

۵۵ء کا سالنامہ

(علماء اسلام نمبر)

سال گزشتہ میں نے سالنامہ ۵۴ء کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کیا تھا کہ "فرمانروایانِ اسلام نمبر" کے بعد میں "علماء اسلام" اور "اماکن اسلام" کا سلسلہ شروع کروں گا تاکہ اس طرح رفتہ رفتہ دو چار سال میں "تاریخ اسلام" کا وہ باب جو ترقی علوم و فنون سے متعلق ہے مکمل ہو جائے، چنانچہ اس کا ایک حصہ "فرمانروایان اسلام" آپ کی نگاہ سے گزر چکا اور اب آئندہ سال کے لئے اس سلسلہ کا دوسرا حصہ پیشِ نظر ہے جو "علماء اسلام" سے تعلق رکھتا ہے۔

اس خاص نمبر میں عرب، ایران، اسپین، مصر، ہندوستان وغیرہ کے ان تمام اکابر علم و ادب کا ذکر کیا جائے گا، جنھوں نے کسی خاص فن یا شعبۂ علم کی کوئی نمایاں خدمت انجام دی ہے اور کوئی نہ کوئی تصنیف اپنے بعد چھوڑ گئے۔

اس سالنامہ کی ترتیب میں حسب ذیل امور کا خاص لحاظ رکھا جائے گا:-

۱- پورا نام معہ ولدیت و کنیت وغیرہ کے
۲- تاریخ ولادت و وفات سنہ ہجری و سنہ عیسوی کے تطابق کے ساتھ۔
۳- مختصر حالات زندگی اور خاص خاص کارنامے
۴- اہم تصانیف کی فہرست
۵- حوالجات جن سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ تاریخ کی کن کن کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے
۶- ایک انڈکس حروف تہجی کے لحاظ سے اور دوسرا علم و فن یا زمانہ کے لحاظ سے۔

اس خاص نمبر میں عہدِ نبوی سے لیکر عہدِ حاضر تک کے تمام ماہرین تفسیر و قرآن - ائمۂ حدیث، فقہا، حکماء، اطباء متکلمین، ماہرین لسانیات و ادب، علماء فلکیات و ریاضیات، طبیعیات و نفسیات، علماء تاریخ و جغرافیہ، سوانح نگاروں اور سیاحوں کا ذکر کیا جائے گا۔

منیجر

اگر ۱۵ تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے۔ لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا (کیونکہ مہینہ کے اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو ۲ گنا محصول ڈاک ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچے کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان میں نگار اور مطبوعات نگار

ان پتوں سے حاصل کیجئے

۱- کتاب محل کراچی
۲- اقبال بک ڈپو کراچی
۳- ہاشمی بک ڈپو - ۱۹۱۰ - الٰہی بخش کالونی، کراچی
۴- کتاب محل راولپنڈی
۵- مکتبۂ جدید لاہور

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ جون میں ختم ہوگیا اور جولائی کا
"نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی۔ پی ہوگا نگار جس میں سالنامہ ۵۵ء کی قیمت بھی شامل ہے
اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۵ | فہرست مضامین جون ۵۴ء | شمار ۶

ملاحظات ---------- ۲
قصّوں کی کہانی ---- ایک پروفیسر ---- ۵
اچھوتیاں ---- تصدق حسین بی۔ اے ال ال بی--- ۱۱
پہلی صدی ہجری میں عربوں کا دوسری اقوام سے اختلاط.. (ڈاکٹر) سعید حسن - ۱۶
رعایتِ لفظی ---- مرزا بشارت اللہ بیگ ---- ۲۰
فارسی کی تاریخی و تمدنی اہمیت... (ڈاکٹر) نذیر احمد (لکھنؤ یونیورسٹی) ۲۳
آزادی کی قربان گاہ پر محمد عاقل ---------- ۳۰
دعوتِ نقد و نظر ---------- ۳۳
ایک سگ پرست فلسفی ---------- ۴۲
گاہے گاہے باز خواں ---------- ۴۷
اقتباسات و معلومات ---------- ۵۲
منظومات... فضا ابن فیضی۔ سعید رزمی۔ محمود اسرائیلی۔ حامد اللہ افسر۔ فراق گورکھپوری ۵۴

ملاحظات

پاکستان کی علمی سیاست

پاکستان، اس وقت تک اپنا دستور مرتب نہیں کر سکا اور جب تک کسی ملک کا دستور ہمارے سامنے نہ ہو ہم اس کے اصول سیاست پر کوئی صحیح رائے زنی نہیں کر سکتے۔ تاہم پچھلے سات سال کے دوران میں وہاں کے ارباب اقتدار نے جو کچھ ظاہر کیا ہے اس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک "اسلامی جمہوریت" ہوگی —— ہر چند "اسلامی جمہوریت" کا کوئی واضح تصور انکے سامنے بھی نہیں ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ دستور کے اندر وہ کس شکل و صورت میں ظاہر ہوگی، تاہم وہاں کے موجودہ واقعات و حالات سے پاکستان کے مستقبل پر جتنی روشنی پڑتی ہے وہ اتنی کم نہیں ہے کہ ہم اس کے پیشِ نظر وہاں کے سیاسی خدوخال کا مطالعہ نہ کر سکیں

ہر ملک کی سیاست دو شعبوں میں منقسم ہوتی ہے، ایک سیاست خارجہ اور دوسری سیاست داخلہ، لیکن یہ تقسیم محض سہولت کار کے لئے ہے ورنہ اصل چیز داخلی سیاست ہے اور اسی کے پیشِ نظر خارجی سیاست کا نقشہ طیار کیا جاتا ہے

ہر ملک کا مطمح نظر ہمیشہ یہ ہوا کرتا ہے (اور یقیناً پاکستان کا نصب العین بھی یہی ہونا چاہئے) کہ اس کی سالمیت و آزادی قایم رہے رعایا اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکے، ذہنی و علمی ترقیوں کے لئے آسانیاں پیدا کی جائیں، ملک کی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے، جماعتی اختلافات ختم کئے جائیں، لوگوں میں حکومت کے ساتھ جذبۂ تعاون کو قوی بنایا جائے اور اپنی تمام ضروریات پوری کرنے میں بہت کم دوسرے ملکوں کا محتاج ہو۔ اسی کا دوسرا نام "داخلی سیاست" ہے اور اسی کے تحفظ و بقا کے پیشِ نظر بین الاقوامی تعلقات پیدا کئے جاتے ہیں جس کا دوسرا نام "سیاست خارجہ" ہے

اب آیئے غور کریں کہ سیاسیات پاکستان کے ان دونوں شعبوں میں کتنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان میں توازن قایم رکھنے کے لیے جو راہیں وہ اختیار کر رہا ہے وہ کس حد تک صحیح و درست ہیں

تقسیم ہند کے بعد پاکستان نے بھی ہندوستان ہی کی طرح کامن ویلتھ سے وابستہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور خیال تھا کہ ان دونوں کی ایک ہی مرکز سے وابستگی دونوں کے تعلقات کو خوشگوار بنا دے گی، لیکن وہ مسئلہ کشمیر کا ہو یا کوئی اور، یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور کامن ویلتھ کے ساتھ ان دونوں کی وابستگی دو مختلف نظریوں میں تبدیل ہوگئی۔ پاکستان چونکہ ہندوستان کی طرف سے مطمئن نہ تھا اور اس کے ذرایع و وسایل بھی محدود تھے، اس لئے اس نے کامن ویلتھ کا دامن تھاما، کیونکہ وہ اس کی مدد کا طالب و محتاج تھا اور ہندوستان کے تیور یہ ہیں کہ اگر وہ انگلستان کی مدد کا خواہشمند ہے تو انگلستان بھی اسی حد تک اس سے خوشگوار تعلقات رکھنے پر مجبور ہے۔ کامن ویلتھ کا دامن اس نے بھی تھاما لیکن اس انداز سے کہ وہ اس کو جب چاہے جھٹک بھی سکتا ہے — یہی وہ فرق تھا جو رفتہ رفتہ پاکستان کو مغربی کمپ کی طرف کھینچ لے گیا اور ہندوستان نے اپنی نیوٹرل پالیسی کا نام بھی "انڈیپنڈنٹ پالیسی" رکھا تاکہ اقوام یوروپ یہ جان لیں کہ ہندوستان جب چاہے اپنی غیر جانبداری ختم کرکے خود اپنا کمپ بھی مغربی کمپ کے خلاف قایم کرسکتا ہے — پھر غور کیجئے کہ ہندوستان و پاکستان کے ان دو مختلف زاویہ ہائے نگاہ کا کیا نتیجہ ہوا — یہ — کہ ہندوستان نے امریکہ سے بہ نسبت پاکستان کے زیادہ امداد حاصل کی لیکن اس کی نوعیت "اقتصادی امداد" کی حیثیت سے آگے نہ بڑھ سکی اور پاکستان نے بہ نسبت ہندوستان کے امریکہ سے کم مدد حاصل کی لیکن وہ "فوجی معاہدہ" ہوکر رہگئی!

پھر پاکستان لاکھ کہے کہ اس فوجی معاہدہ سے پاکستان کی آزادی و خود مختاری پر کوئی حرف نہیں آسکتا لیکن اس بات کا جواب اس کے پاس کیا ہے کہ اس امداد کا نام "فوجی معاہدہ" رکھا ہی کیوں گیا؟ اگر پاکستان کو اپنی دفاعی قوت کو مضبوط بنانا تھا تو کیا وہ ڈالر کے اُن ذخایر کو جو "اقتصادی امداد" کے نام سے اس کو ملتے، اسلحہ کی خریداری اور فوجی تنظیم پر صرف نہیں کرسکتا تھا کتنا بڑا فرق ہے اس میں کہ ہم کسی رقم کو خود اپنی مرضی سے خرچ کرسکیں اور اس امر میں کہ ہم اس کے صرف میں دوسروں کی مرضی کے محتاج ہوں — وہ تو کہئے خیریت ہی ہوئی کہ پاکستان میں اس وقت تک صرف ایک ہی سال غلہ کی کمی محسوس کی گئی، اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ دوسرے سال تک قایم رہتا تو فوجی معاہدہ کے بجائے غالباً امریکی فوجیں پاکستان میں پہونچ چکی ہوتیں

کیا پاکستان واقف نہیں کہ اس پر امریکہ کی یہ تمام نوازشیں صرف اسلئے ہیں کہ روس کے خلاف مشرقی وسطی کے بلاک کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا جائے اور کیا اس کا امریکن بلاک کی اس پالیسی کے سامنے سر تسلیم خم کردینا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ ہندوستان اور دوسری ایشیائی حکومتوں سے کٹ کر اپنی خارجہ پالیسی اینگلو امریکن بلاک کے ہاتھ میں دیدینا چاہتا ہے

اس کے جواز میں پاکستان کے اخبارات یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ اگر آیندہ جنگ میں دُنیا کے ہر ملک کو کسی نہ کسی بلاک کی طرف سے لڑائی میں شامل ہونا ناگزیر ہے تو کیوں نہ پاکستان پہلے ہی سے اپنی پالیسی واضح کردے۔ لیکن اس دلیل کے دونوں ٹکڑے غلط ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ آیندہ جنگ میں انفرادی طور پر کسی ملک کی غیر جانبداری قایم نہیں رہ سکتی لیکن اگر ایشیا کی سلطنتیں سب مل کر ایک نیوٹرل بلاک بنالیں (جیسا کہ ہندوستان چاہتا ہے) تو اس سے نہ صرف یہ ہوگا کہ ایشیا کی غیر جانبداری قایم رہے گی بلکہ آیندہ جنگ کے امکانات بھی بڑی حد تک ختم ہوجائیں گے۔ اب دلیل کے دوسرے ٹکڑے کو لیجئے تو وہ بھی بالکل بے معنی ہے کیونکہ کسی ملک کا جنگ سے قبل ہی اپنی آیندہ پالیسی کو متعین کردینا حد درجہ ناعاقبت اندیشانہ بات ہے، لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کرلیں کہ پاکستان کو اپنی معاشی و اقتصادی دشواریاں دور کرنے کے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا، تو پھر اس کو یہ نہ کہنا چاہئے کہ امریکہ کے ساتھ اس کا فوجی معاہدہ اسکی سلامتی کا ضامن ہوسکے گا یا اس کی آزادی کو کسی پہلو سے متاثر نہ کرے گا، کیونکہ پاکستان کا مغربی کمپ میں شامل ہوجانا صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ روس سے اس نے ہمیشہ کے لئے بگاڑ کرلیا اور روس کی سرحد پاکستان سے اس قدر ملی ہوئی ہے کہ امریکن بلاک اسے تباہی سے بچا ہی نہیں سکتا

جب تک وہ اندرون پاکستان میں اور سواحل پاکستان پر عظیم الشان بری، بحری و فضائی مرکز قایم نہ کرے — اور — اس فوجی معاہدہ کے بعد آج نہیں تو کل امریکہ کے جہازوں، اس کی رجمنٹوں، اس کے بمباروں اور فوجی کارخانوں کے لئے، پاکستان کو اپنی زمین اور اپنا سمندر خالی کرنا پڑے گا — پھر اگر یہ فیصلہ وہاں کے عوام کا ہوتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ صرف وہاں کے گورنر جنرل، وزیر اعظم اور ان کے رفقائے کار کا ہے، جس کو نہ مشرقی بنگال پسند کرتا ہے اور نہ مغربی پاکستان کی اکثر جماعتیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ٹائمز آف انڈیا کے اڈیٹر مسٹر فرینک ماریسن کی وہ رپورٹ ہے جو حال ہی میں پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد انھوں نے شایع کی ہے — انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"پاک امریکی معاہدہ ہوجانے کے بعد پاکستانی عوام محسوس کر رہے ہیں کہ حکومت پاکستان نے ان کو امریکہ کے ہاتھ فروخت کردیا ہے اور مسٹر غلام محمد کے اس بیان کو کہ امریکہ کی امداد غیر مشروط ہے وہ صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ پاک امریکی معاہدہ کی دفعہ (۴) کی رو سے امریکی حکومت کے جو افسر پاکستان آئیں گے ان پر براہ راست امریکی حکومت کا کنٹرول ہوگا اور وہ پاکستانی قوانین کے پابند نہ ہوں گے جس کے معنی یہ ہیں کہ پاکستان کے نظم و نسق کا مرکز واشنگٹن ہوگا نہ کہ کراچی، اور عنانِ حکومت امریکی سفیر کے ہاتھ میں ہوگی نہ کہ مسٹر محمد علی کے ہاتھ میں — پاکستانی فوجوں میں بھی اس معاہدہ کے خلاف جذبہ بڑھتا جارہا ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہیں کہ معاہدہ کی رو سے پاکستانی افواج کے کمانڈر انچیف امریکہ کے فوجی مشیروں کے ہاتھ میں ہوں گے

جہاں تک پاکستانی اڈوں کو امریکہ کے حوالہ کرنے کا تعلق ہے، باوجود حکومت کی تردید کے، کراچی کے عوام کو یقین ہے کہ معاہدہ کی دفعہ (۲) کی رو سے امریکہ، اجتماعی سلامتی کے نام سے ہر وقت ان اڈوں کو استعمال کرسکتا ہے، علاوہ اس کے سب سے زیادہ قابلِ اعتراض بات یہ سمجھی جاتی ہے کہ پاکستان کو فوجی سامان کے استعمال کے لئے امریکہ کا مشورہ لینا ضروری ہوگا۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ امریکہ اس سلسلہ میں پاکستان کی نہ صرف فوجی بلکہ خارجہ پالیسی پر بھی حاوی ہوجائے گا"

یہ رپورٹ ایک انگریز کی ہے جسے قدرتاً پاک امریکی معاہدہ کا طرفدار ہونا چاہئے اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اسے غلط سمجھا جائے۔

پاک امریکی معاہدہ پر جو اس وقت تک صرف کاغذ تک محدود ہے ابھی تک عملی کارروائی شروع نہیں ہوئی اور اگر بعض امریکی اخبارات کے بیانات صحیح ہیں تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب تک پاکستان کے اندرونی جھگڑے ختم نہ ہوجائیں گے امریکہ اس باب میں کوئی عملی قدم نہ اٹھائیگا کیونکہ مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی شکست کے بعد مرکزی حکومت میں بھی ہر وقت تبدیلی کا امکان ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ نئی حکومت کا رجحان کیا ہوگا

اب پاکستان کی سیاست داخلی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اور زیادہ ناکام ہے، اشیاء کی ناقابل برداشت گرانی، جماعتی نزاعات مسلم لیگ کی بے عملی، مشرقی و مغربی پاکستان کے شدید باہمی اختلافات، انڈسٹریل تنظیم کا فقدان، عمال کی خیانت و بددیانتی اور نظام معاشرہ کا یکسر تعطل — یہ ہیں حالات وہاں کی سیاست داخلہ کے جنھوں نے ملک میں عام بے اطمینانی اور بے چینی پیدا کر رہی ہے اور جن کے دور ہونے کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی، کیونکہ صحیح معنی میں وہاں سیاسی لیڈرشپ بالکل مفقود ہے اور حکومت صرف ان چند جاہ پرست افراد کے ہاتھ میں ہے جنھیں عوام سے کوئی تعلق نہیں ہے

مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی ناکامی نے بہت زیادہ پیچیدگی پیدا کردی ہے اور چونکہ اکثریت اسی کی ہے اس لئے بعض ایسی آئینی گتھیاں پڑگئی ہیں جن کو سلجھانا آسان نہیں۔ حال ہی میں نرائن گنج میں جو فساد ہوا وہ زیادہ تر بنگالی اور غیر بنگالی مسلمانوں ہی سے تعلق رکھتا تھا اور یہ اس قدر خراب علامت ہے کہ اگر وہاں کی اس ذہنیت کو ختم نہ کیا گیا تو اس کا ردعمل مغربی پاکستان میں بھی شدید ہوگا اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فساد کی پشت پر کمیونسٹوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور ان کو خلاف قانون جماعت قرار دینے پر زور دیا جارہا ہے لیکن اگر پاکستان نے ایسا کیا تو یہ گویا خانہ جنگی کو دعوت دینا ہوگا، جسے پاکستان بہ حالات موجودہ کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا۔

قصّوں کی کہانی

تمہید ٹے شیس (Ktesias) کے زمانہ سے (جو قبل مسیح، چوتھی صدی کے آخر اور تیسری صدی کے شروع میں عرصہ تک شاہ ایران کے دربار سے وابستہ رہا) ہندوستان کی سرزمین، افسانوں، رومانوں، اور عجائبات سے لبریز رہی ہے اور یہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے عجائبات مشرق کی تفصیل مغرب کے سامنے پیش کی۔

یوروپ اور ایشیا میں نہایت قدیم زمانہ سے سلسلۂ سفر، تعلقاتِ تجارت اور تبادلۂ خیالات قایم ہے اور بین الاقوامیت کوئی نئی چیز نہیں ہے ——— چنانچہ سب سے پہلے سکندر اعظم نے ایران اور ہندوستان پر حملہ کرنے کے بعد احکام جاری کئے کہ تمام مفتوحہ ممالک کے درمیان رشتۂ ارتباط قایم کیا جائے۔ غالباً وہ اس کا معتقد نہ تھا کہ "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور دونوں کبھی متحد نہیں ہو سکتے"۔

سکندر کی قبل از وقت موت نے اُس کی تمام کوششوں اور ارادوں کا خاتمہ کر دیا لیکن یہ خیال لوگوں کے دلوں میں باقی رہ گیا۔ اس کی وفات کے بعد ہندوستان میں موریا خاندان کا عہد حکومت شروع ہوا جو عہد رومۃ الکبریٰ کے آخری دو صدیوں کا ہمعصر ہے۔ اس خاندان کے فرمانروا چندر گپت نے ایک یونانی شہزادی سے عقد کیا اور اسی عقد کی وجہ سے شام اور موریا خاندان کے فرمانرواؤں میں کئی پشت تک سلسلۂ قرابت و اتحاد قایم رہا۔ چندر گپت کے دربار میں شلوقی کی جانب سے میگس تھینز سفیر بن کر حاضر ہوا تھا اور جب چندر گپت کی وفات پر اس کا بیٹا وندوسار تخت نشین ہوا تو شلوقی نے ڈیماکس کو سفیر بنا کر اُس کے دربار میں بھیجا، اس کے بعد ٹالمی فلیڈلفر نے ڈایونشیس کو بطور سفیر ہندوستان روانہ کیا لیکن یونانیوں سے قبل دارا نے پنجاب کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا ایک جزو قرار دیدیا تھا اور بعد کے کتبوں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس شہنشاہ نے ہندوؤں کو اپنی رعایا میں ظاہر کیا ہے، اسکے علاوہ زکسیز کے ہمراہ ہندی افواج یونان گئی اور مارڈونیس کی سرکردگی میں ایک مدت تک فارسی اور یونانی افواج کے ہمراہ رہی۔

جب اشوک نے بودھ مذہب اختیار کر لیا تو اُس نے اپنے احباب یونانی فرمانروایان مصر، شام اور مقدونیہ کے پاس اپنے مذہب کی دعوت دینے کی غرض سے علماء روانہ کئے۔ اشوک ہی نے ٹالمی فیلڈلفر کے مشورہ سے شہر سکندریہ آباد کیا تاکہ وہ ہندی اور مصری تجارت کا ایک مرکز بن جائے۔ اس امر کا کافی ثبوت موجود ہے کہ پہلی صدی سے بعد کے زمانہ میں ہند، یونان اور روم کے مابین بہت زیادہ ارتباط قایم تھا اور ہندوستانی اور ہندوستانی اشیاء نے یونانی اور رومی دماغوں پر اس قدر گہرا اثر پیدا کر دیا تھا کہ یہاں کا سامان تعیش روم میں بکثرت استعمال ہوتا تھا۔

اس سلسلہ میں وہاں جو بستیاں قایم ہو گئی تھیں، وہاں ہزاروں رومی سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں، اسی طرح بہت سے ہندوستانیوں نے مصر اور اقصائے مغرب میں سکونت اختیار کر لی تھی اور شہنشاہ اگسٹس اور بعد کے فرمانرواؤں کے دربار میں ہندوستانی سفیر بھی حاضر ہوتے تھے۔

ان تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھ کر یہ بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ قدیم یونانی افسانوں کو دلآویز بنانے میں مشرق نے کس درجہ حصہ لیا اور فردن اوئی کی تصانیف میں (مثلاً Marvels beyond Thule + AEthiopica) مشرقیت کیوں خاص طور پر نمایاں ہے۔

ایسپ Aesop کے قصے

تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسپ حضرت مسیح سے چھ صدی قبل بمقام سیماس ایک یونانی غلام کی زندگی بسر کیا کرتا تھا اور بقول افلاطون، سقراط نے بحالت قید اپنی عمر کا آخری حصہ انھیں قصوں کے نظم کرنے میں صرف کردیا جو ایسپ کے نام سے مشہور تھے۔ ان قصوں کا کوئی قدیم نسخہ دستیاب نہیں ہوتا، البتہ ایک مجموعہ یونانی زبان میں مرتبہ بیبرس (جو شاید پہلی یا دوسری صدی عیسوی کا تحریر کیا ہوا ہے) اور دوسرا لاطینی زبان میں موسومہ فیڈرس پایا جاتا ہے۔

پہلے مجموعہ کی تالیف پہلی صدی میں ہوئی ہے، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بیبرس مشرقی تھا اور ملک شام میں سکونت رکھتا تھا جہاں ان افسانوں نے شروع میں بڑی شہرت حاصل کی تھی حتےٰ کہ یہ مجموعہ درس میں بھی داخل ہوگیا تھا۔ مشہور ترین اور نہایت موثر مجموعہ وہ تھا جو تیرھویں صدی عیسوی میں ایک یونانی راہب پلینوڈیز نے تالیف کیا تھا لیکن یہ نسخہ مشرق کی مشہور کتاب بدپائی پنچ تانتر کے لٹریچر سے بہت کچھ متاثر ہے۔ جس کے ترجمے چودھویں صدی کے قبل مغربی زبانوں میں شایع ہوچکے تھے۔

بدپائی پنچ تانتر

اگر بودھ کے افسانہائے ولادت سے قطع نظر کرلیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قدیم ترین افسانے وہ ہیں جو یوروپ میں افسانہائے بلپے یا بدپائی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا اصلی نام سنسکرت میں پنچ تانتر ہے اس کا خلاصہ ہت اپدیش کے نام سے مشہور ہے جس کے معنے دوستانہ نصائح کے ہیں، ان ہندی افسانوں میں در پردہ اخلاقی نکتے دکھلائے گئے ہیں، جن میں باستثناء چند قصص کے سارے افسانے جانوروں کے ہیں۔ ہندوستان میں اس کتاب کے مشہور نسخے بہت سے ہیں مگر اصلی نسخہ تلف ہوگیا ہے اس کی تاریخ تصنیف کی نسبت اختلاف ہے، لیکن یقینی یہ ہے کہ اس کی ترتیب پہلے اور چوتھی صدی عیسوی کے درمیان ہوئی ہے

چھٹی صدی یعنی عہد نوشیرواں میں اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا، پھر دو برس کے بعد خلیفہ منصور (۷۵۳ء تا ۷۷۴ء) کے زمانہ میں اس کتاب کا پہلوی سے عربی میں، رزبہ نامی ایک عجمی النسل شخص نے ترجمہ کیا جو بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اور عبداللہ ابن المقفع کہلاتا تھا۔ اس کی یہ کتاب مشرق میں "کلیہ دمنہ" کے نام سے مشہور ہے اور یہی عربی کا ترجمہ آیندہ تمام ترجموں کی اصل ہے۔

دسویں یا گیارھویں صدی میں، عربی سے یہ کتاب شامی زبان میں ترجمہ کی گئی، گیارھویں صدی میں یونانی زبان میں، بارھویں صدی میں جدید فارسی میں، اور تیرھویں صدی میں قدیم اسپینی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ عبرانی نسخہ کا تیرھویں صدی میں لاطینی زبان میں اور پندرھویں صدی میں لاطینی سے جرمنی زبان میں ترجمہ ہونا پایا جاتا ہے، پندرھویں صدی میں لاطینی سے اسپینی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا اور سولھویں صدی میں اسپینی سے اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا، اسی صدی میں لاطینی سے اسپینی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا اور سولھویں صدی میں اسپینی سے اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا، اسی صدی میں اطالوی سے سر ٹامس نارتھ نے اس نسخہ کو بزبان انگریزی ترجمہ کیا۔

انگریزی ترجمہ اطالوی نسخہ کا ترجمہ تھا، اطالین ترجمہ اسپینی نسخہ کا، اسپینی ترجمہ لاطینی کا، لاطینی عبرانی کا، عبرانی عربی کا، عربی پہلوی کا، اور پہلوی اصل ہندی کتاب کا ترجمہ تھا، اور یہ کتاب ایک ہزار سال کے اندر پانچ درمیانی ترجموں کے سلسلہ وار منتقل ہوکر انگریزی زبان میں آئی۔

۱۸۰۰ء و ۱۶۱۰ء کے درمیان اس کا ترجمہ جرمن زبان میں پندرہ بار شایع ہوا، ۱۶۱۸ء میں ڈینش زبان میں، ۱۶۲۳ء میں ڈچ، اور ۱۸۴۳ء میں سوڈانی میں ترجمہ شایع ہوا۔ لافان ٹین کو اصل نسخے سے امداد کا اعتراف ہے اور قریب قریب اسکے ۱۸ افسانوں کا ماخذ پہلے ہے۔

پنچ تانتر کا شجرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ متعدد مغربی زبانوں میں ہوا اور اس واقعہ نے یوروپ کے قرون متوسط کے ادبیات پر ایک نتیجہ خیز اثر پیدا کر دیا ان ترجموں میں ایک ہی قسم کے واقعات مسلسل پیرائے میں نقل کئے گئے ہیں تاہم مختلف ملکوں کے مذہبی خیالات کی نیرنگیوں اور مختلف زبانوں میں تحریر کئے جانے کی وجہ سے اُن میں اختلاف نظر آتا ہے، مثلاً اصلی تانتر میں بعض جانور تارک الدنیا حالت میں دکھلائے گئے ہیں اور گوشت نہیں کھاتے گویا برہمن اور بدھ مذہب کا اُن پر غلبہ ہے۔

فارسی قصہ میں مجوسیت پائی جاتی ہے اور عربی میں بعض جانوروں کے خیالات پکے مسلمانوں کے سے ہیں جو ہمیشہ موذن کی اذان پر کان لگائے ہوئے ہیں، جابجا قرآن شریف کا حوالہ دیتے ہیں اور پے در پے حج ادا کرتے ہیں۔

سن من ستھ کے یونانی نسخہ میں وہ گوشہ نشین درویشوں کے لباس میں دکھلائے گئے ہیں۔ مولف مذکور نے تمام جانوروں کو آپس میں باتیں کرتے دکھلایا ہے اور اس طرح پر ایسپ کے اشعار کی نقل کی گئی ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ ۳۸ زبانوں میں ۱۱۲ مختلف پیرایوں میں کیا گیا اور ۱۸۰ بار شایع ہوئی۔ انجیل مقدس کے علاوہ دنیا میں کسی اور تصنیف کے نہ تو اس قدر تراجم پیش کئے گئے اور نہ اس کو اس قدر اشاعت حاصل ہوئی۔

اس کی عظیم الشان اشاعت محض قصوں کی دلچسپی کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ زیادہ تر اُن اخلاقی حکمتوں کی وجہ سے ہوئی جو ان میں پائی جاتی ہیں، صدہا سال مغربی مدارس میں بچوں کی دنیاوی تعلیم انھیں ادبی پاکیزہ خیالات سے شروع کی جاتی تھی، جس کا اظہار ہندوؤں اور معتقدین بودھ نے دو ہزار سال قبل ہندوستان کے کسی سنسان گاؤں میں کیا تھا۔

ادبی تاریخ میں اس سے زیادہ عجیب کوئی چیز نہیں، انسانی تصنیف کی اس قدر حیرت انگیز ادبی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی شاید ہی کوئی اور مثال مل سکے۔

یہ ظاہر ہے کہ ان تصانیف کی اشاعت کا طریقہ یہ ہوا کہ اول سنسکرت یا پراکرت سے فارسی میں آئیں، فارسی سے عربی میں، عربی سے شامی و عبرانی میں اور پھر عبرانی سے لاطینی اور قدیم اسپینی زبان میں پہونچیں، اس لئے تحقیقات کے دو طریقے معلوم ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ مغربی حصہ عرب اور شامی ادبیات کے ساتھ ساتھ ملک شام اور فلسطین کے عہد وسطی کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرلیا جائے تو ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ مغربی حصۂ یوروپ میں شام اور فلسطین سے مجاہدین زائرین اور سیاح درویشوں کے معرفت کیا کیا پہونچا، نیز یہ کہ قسطنطنیہ اور مشرق ادنیٰ سے بذریعہ تجارت اسے کیا کیا حاصل ہوا۔

دوسرے یہ پتا چلانے کے لئے کہ مغرب ادبیات و دیگر علوم میں مشرق کا کس درجہ مرہون منت ہے۔ قدیمی اسپین تاریخ یہود اور اسپین کے علم و ادب کے گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ دسویں صدی عیسوی کے قریب جب اُندلس میں مسلمانوں کا عروج تھا، یہودی تہذیب اعلیٰ ترین پیمانہ پر تھی اور یہودیوں نے بڑا اثر پیدا کرلیا تھا۔ ان کی فطری تجارت پسندی نے بحر روم کے قرب و جوار کی اعلیٰ عربی معاشرت ان میں پیدا کر دی تھی اور چونکہ بلحاظ نصرانیت اُن کا مذہب اسلام سے زیادہ ملتا جلتا تھا اس لئے انھوں نے عیسائیوں اور اہل اسلام کے مابین ثالث کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔

آٹھویں اور نویں صدی میں بغداد مشرقی خیالات کی اشاعت کا ایک عظیم الشان سرچشمہ تھا اور ان ایام میں بغداد اور ہند میں اتحاد ہونے کا ہمارے پاس بڑا ثبوت موجود ہے۔

تحصیل علم کی غرض سے ہندوستان کو طلبہ بھیجے جاتے تھے اور ان سے علم الادویہ، فلسفہ، فلکیات، منطق، سیاست مدن، علم اخلاق اور ریاضیات کی ہندی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا جاتا تھا اور ایسے طالبعلموں اور ایسے ترجموں کی ایک بڑی فہرست

ہمارے علم میں ہے۔

فزیولوگس بیسٹیاریز کے سلسلہ میں یہ عیسوی استعمارات کا ایک مجموعہ ہے اس میں قریب قریب تمام خیالات حیوانات سے لئے گئے ہیں، اس مجموعہ میں ۴۹ قصے ہیں اور ہر قصہ میں ایک خاص جانور کا ذکر ہے اور اس جانور کے متعلق مصنوعی افسانے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب دوسری صدی عیسوی میں اسکندریہ میں تصنیف ہوئی اور شاہی یونانی، ارمنی، لاطینی، نیز قدیم انگریزی اور فرانسیسی اور جرمنی وغیرہ زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ ایک زمانہ سے یہ خیال ہے کہ اس میں ہندوستانی خیالات موجود ہیں اور گزشتہ چند سال کے عرصہ میں مسلم طور پر یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ بہت سے خیالات اس میں صرف مشرقی جانوروں سے لئے گئے ہیں، منجملہ چند مصنفین کے ایک کا قول یہ ہے کہ تقریباً ساری کتاب کسی معدوم ہندوستانی نسخہ کا خلاصہ ہے۔

کلیر کے لئے ڈسپلینا اور گیسٹا رومنورم مشرقی افسانوں کے یورپین زبان میں منتقل ہونے سے کئی صدی پہلے لاطینی زبان میں ان افسانوں کے دو ایسے مشہور مجموعے موجود تھے جن کا ماخذ خاصکر مشرق تھا اور جن کو خود یوروپ کے بہت سے مشہور مجموعہ کا ماخذ سمجھنا چاہئے یہ "Gesta Romanorum اور Clericalis Disciplina" کے نام سے مشہور ہیں۔ اول الذکر کتاب پیٹر ایلفونسس یہودی باشندہ اسپین نے بارھویں صدی میں تصنیف کی اور دوسری چودھویں صدی میں تصنیف ہونا بتلائی جاتی ہے۔ اٹلی کے قدیم افسانہ نگاروں پر اس آخرالذکر تصنیف کا بہت بڑا اثر پڑا، نیز انگریزی شاعری پر بھی اس کا ویسا ہی نمایاں، اثر پایا جاتا ہے، اس تصنیف نے گوور اور چاسر اُن کے تاریخ کا نس ٹینس کا مسالہ مہیا کیا، شیکسپیر کو، کنگ لیر اور مرچینٹ آف وینس کی تصنیف کا خیال دلایا اور اسی تصنیف نے پارنل کو ہربٹ کے مضمون کی جانب متوجہ کیا۔

اس میں جو صریحاً مشرقی خیال پر مبنی ہے بہت سے ایسے افسانے پائے جاتے ہیں جن کا ماخذ یقیناً ہندوستان ہے اور جو الفونسس کے دماغ میں عربی زبان کے توسط سے پہونچے۔

سندباد اگر ہم المسعودی، عربی مورخ کے قول کو صحیح سمجھیں تو ایک ہندی تصنیف المسمیٰ بہ کتاب سندباد کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس کے بے شمار ترجمے اور نقلیں ایشیائی اور انگریزی زبانوں میں شایع ہوئیں، ان سب میں دیرین نسخہ وہ ہے جو عبرانی زبان کا ہے اس نسخہ کے متعلق یہ ثابت ہوا ہے کہ بارھویں صدی میں لکھا گیا تھا، تیرھویں صدی میں ڈی جھاس نامی راہب نے عبرانی سے لاطینی میں ترجمہ کیا جو Historia septem sapientum کے نام سے مشہور ہے۔ بعد ازاں اینڈریو فوس نامی ایک عیسائی نے اس کتاب کا عبرانی زبان میں ترجمہ کیا اور اس کا نام Syntipas رکھا۔ اس شخص نے اپنے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ اُس نے یہ ترجمہ شامی زبان سے کیا۔ عبرانی اور شامی زبان کے علاوہ سندباد کے ترجمے اور انتخابات دو شرقی زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں بھی موجود ہیں عربی ترجمہ اب کتاب الف لیلہ میں شامل ہے اور اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر جونیتھن اسکاٹ کی کتاب میں شامل ہے، جو ۱۸۰۰ء میں شایع ہوئی تھی فارسی نظم میں اس کتاب کے دو ترجمے ہوئے ارزقی نے سندباد کے نام سے کیا اور دوسرے ترجمے کا پتہ یوروپ کو پروفیسر فاکنز کے ذریعہ سے چلا جس نے سندباد کے ایک قدیم نسخے کی تاریخی تحقیق و تحلیل نہایت قابلیت سے کی ہے، اس لاجواب کتاب کا ترجمہ قریب قریب تمام مغربی زبانوں میں ہوگیا ہے۔

شاہزادہ بختیار کا افسانہ تامیل زبان میں ایک قصوں کی کتاب "الکشور کتھا" ہے جو شاہزادہ بختیار کے افسانہ سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے اس میں الکھ پور کے بادشاہ کے چار وزیروں پر بدچلنی کا الزام لگایا گیا تھا

اس لئے انھوں نے اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے اور بادشاہ کا غصّہ فرو کرنے کی یہ ترکیب سوچی کہ بہت سے افسانے سُنائیں ——
ڈی لانگ سیمپ ( ) نے اپنی کتاب (
میں تحریر کیا ہے کہ مشرقی زبانوں میں بختیار نامے کے تین نسخے تھے، ایک فارسی میں دوسرا عربی میں، تیسرا ترکی زبان میں۔ ترکی نسخہ جس کی تاریخ تالیف ۱۴۳۴ء ہے عربی کا ترجمہ تھا اور عربی فارسی نسخہ کا ترجمہ تھا اور چونکہ اس میں دو افسانے ایسے ہیں جو سنسکرت کے نسخہ میں پائے جاتے ہیں اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کے دیگر افسانے بھی ہندی تصانیف سے اخذ کئے گئے ہوں گے۔

مزاحی افسانے یوروپ کے مزاحی افسانے جو آرلاٹو، ربلیس، اسکلٹن اور ڈک ٹارلٹن سے منسوب ہیں ان میں سے اکثر مشرق سے پہونچے ہیں کیونکہ بلحاظ مناسبت مقامی تھوڑے اختلاف کے ساتھ وہ پرانی ہندی تصانیف میں موجود ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ بہت سے مشہور و معروف یورپین افسانے مشرق سے ماخوذ ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان ہی ان افسانوں کا منبع تھا اور وہ یوروپ میں عرب کے توسط سے پہونچا۔ یعنی علاوہ دیگر طریقوں کے وہ یوروپ میں ان مسلمانوں کے ذریعہ سے پہونچے جنھوں نے آٹھویں صدی میں اُندلس میں سکونت اختیار کی، نیز اُن صلیبی مجاہدین اور زائرین کے ذریعہ سے جو بیت المقدس سے واپس آئے اور شاید اُن سوداگران اندلس کے ذریعہ سے بھی جو جزائر مشرق اور جنوبی افریقہ کے حصّوں میں تجارت کرتے تھے۔ شمالی فرانس کے بہت سے مزاحی افسانے مشرق سے ماخوذ ہیں اور روم کے ابتدائی افسانہ نگاروں کا ماخذ بھی مشرقی افسانے تھے، احمقوں کے افسانوں کا قدیم ترین مجموعہ وہ ہے جو کتھا سرت ساگر کے نام سے مشہور ہے اس کی پیروی مسٹر راسٹن نے میں کی اور جرمنی زبان میں "علی بابا اور چالیس چور" "الہ دین کے چراغ" اور اسی نوع کے دوسرے افسانے عربی، فارسی اور ہندی کتابوں سے منتقل ہوئے ہیں، اسی طرح "سونے کا انڈا دینے والی بطخ" کا اصل قصّہ ہندوستان کی عظیم الشان کتاب رزمیہ مہابھارت میں بیان کیا گیا ہے۔

بودھ کے افسانے میکس مولر کا قول ہے کہ ہمارے قصّوں اور کہانیوں کی اصل مذہب بودھ ہے، یہودیوں میں عدالت سلیمان کے متعلق بہت سے افسانے رائج ہیں، لیکن تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ بودھ کی مذہبی کتابیں اس قسم کی کہانیوں سے معمور ہیں، کتاب کنجوریں "ٹری پی ٹاکا" کا تبت کی زبان میں ترجمہ موجود ہے، ہم نے اس میں پڑھا ہے کہ "دو عورتوں میں سے ہر ایک اس امر کی دعویدار تھی کہ فلاں بچّہ کی ماں میں ہوں، بادشاہ نے یہ قصّہ بہت دیر تک سُنا مگر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ حقیقتاً بچّہ کی ماں کون ہے، یہ دیکھ کر وسائھا نے عرض کیا کہ ان عورتوں سے جرح کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بچہ ان کو دیدیا جائے وہ خود ہی آپس میں فیصلہ کرلیں گی، یہ سنتے ہی دونوں عورتیں جھپٹیں اور جب نزاع بڑھا تو بچّہ کے چوٹ آگئی اور وہ رونے لگا یہ دیکھ کر ایک عورت جھگڑے سے باز رہی اور بچّہ کو چھوڑ دیا اس وجہ سے کہ وہ بچّہ کو روتا نہیں دیکھ سکتی تھی، اسی بات پر معاملہ طے ہوگیا اور بادشاہ نے اصل ماں کے بچہ سپرد کر دیا اور جھوٹی عورت کو سزا دی"۔

برلام وجوزیفاف دنیا کی ادبی تاریخ میں نہایت جوش انگیز بارلام اور جوزیفات کا قصہ ہے، جس کو جان دمشقی نے حالات بودھ کی ایک ہندی کتاب سے آٹھویں صدی عیسوی میں عہد خلیفہ منصور میں یونانی زبان میں ترجمہ کیا "جوزی فات" لفظ "بودھی ستوا" ترجمہ ہوا۔ اور قرونِ وسطیٰ کی مشہور ترین کتاب تسلیم کی گئی۔ اس کا ترجمہ شامی اور عربی زبان میں فارسی سے ہوا اور فارسی میں اصل ہندی زبان سے۔ اس قصہ کا ہیرو ایک ہندی النسل شخص بلکہ خود تھا۔ جو یونانی اور رومن مذاہب میں جوزیفات کی صورت میں حد درجہ ولایت تک پہونچا دیا گیا ہے۔

شیکسپیر کے مرچنٹ آف وینس میں کاسکٹ (کشتی) کا خیال لاطینی تصنیف گسٹار ومنورم کے توسط سے اسی کتاب سے لیا گیا ہے، جس میں بہت سے مشرقی خیالات پائے جاتے ہیں، یہی کیفیت، پندرھویں صدی کے انگریزی اخلاقی ڈراما "یوری مین"

اور "پارڈنرس ٹیل" مصنفۂ چاسر کی ہے۔

الف لیلہ اٹھارھویں صدی کے شروع میں یورپ اور خصوصاً فرانس و انگلستان میں مشرقی ادبیات کی ایک پرجوش لہر پھیل گئی، جب گیلینڈ نے الف لیلہ کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ۱۷۰۴ء و ۱۷۱۲ء کے درمیان کیا تو ہر طرف ہل چل مچ گئی اور اس کا بڑا گہرا اثر پڑا، اسی سلسلہ میں بہت سے دیگر فارسی اور ترکی تصانیف کے ترجمے ہو گئے، ہمارے پاس دسویں صدی کے معتبر مصنفین کی تصدیق ہے کہ اصلی نسخہ الف لیلہ عربوں کے پاس فارس سے پہونچا اور اس کا آخری کھوج ہندوستان تک ملتا ہے۔

یہ بھی ملاحظہ طلب امر ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخری حصہ میں مغرب میں سنسکرت کا چرچا ہوا اور سنسکرت تصانیف کے ترجمے شایع ہوئے، تو مشرقی علوم کی لہر یورپ میں پھیل گئی اور اُنیسویں صدی میں وہاں کے مختلف علوم پر ان تراجم کا بہت بڑا اثر پڑا غرض یورپ مشرقی اثرات سے منکر نہیں ہو سکتا۔

ایک پروفیسر

نکاہات وائلڈ

۱- صدائے بازگشت اکثر اس آواز سے زیادہ دلکش ہوتی ہے جس کی بازگشت ہے۔

۲- کہنے کے قابل وہی باتیں ہیں، جنھیں ہم بھول جاتے ہیں جس طرح وہی باتیں کرنے کے قابل ہیں، جن پر دنیا تعجب کرتی ہے۔

۳- میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر کوئی نہیں کہ اُس شخص کو پاکباز پاؤں جس کی طرف سے مجھے پاکبازی کی کبھی توقع نہ ہو۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے کسی نرم چیز میں کوئی سوئی چبھی ہو اور وہ دفعتاً چبھ جائے، اگر ہم پاکباز ہیں تو ہمیں لوگوں کو آگاہ کر دینا چاہیئے۔

۴- دنیا میں جیئے اُنھیں لوگوں کو معلوم ہے، جنھوں نے فراموشکاری سے محبت کرنا سیکھ لیا ہے۔

۵- جوانی کے اعادہ کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں کہ پھر اپنی حماقتوں کی تکرار کی جائے۔

۶- جس سے محبت کی جائے اس کے ساتھ راست باز رہنا حقیقتاً نہایت مشکل ہے

۷- اچھے ہونے سے اچھی صورت کا ہونا بہتر ہے جس طرح بُری صورت رکھنے سے اچھا ہونا قابل ترجیح ہے۔

اقوال سقراط

✓ خدا نے آدمی کو ایک زبان اور دو کان دئے ہیں تاکہ وہ سنے زیادہ اور بولے کم۔

✓ اگر میرے اس کہنے سے کہ "میں نہیں جانتا" لوگ یہ نہ سمجھتے کہ میں "جانتا ہوں" تو میں یہی کہتا کہ "نہیں جانتا"۔

✓ نیند ایک مختصر موت ہے اور موت نوم طویل۔

✓ اگر تمہارا راز تمہارے سینہ میں نہیں سما سکتا، تو دوسرے کے سینہ میں کیسے سمائے گا۔

✓ ایک بداخلاق لیکن شریف شخص نے اس سے پوچھا:-
"اے سقراط تم کو اپنی رذیل قوم سے نفرت نہیں ہے"۔
سقراط نے جواب دیا:- "تمہاری قوم کا تم پر خاتمہ ہو گیا، اور میری قوم کی ابتدا مجھ سے ہوتی ہے"۔

✓ ایک بار کسی آدمی نے اس سے کہا کہ:- "شہر والوں سے آج جو گفتگو تم نے کی ہے وہ ہرگز پسند نہ کی جائے گی"۔
اس نے کہا کہ:- "مجھے اس سے رنج نہیں ہوتا کہ میری بات نہیں مانی گئی بلکہ تکلیف اس سے ہوتی ہے کہ میری بات صحیح نہ ہو"۔

اچھوتیاں

زمانہ شاہی میں دو چیزیں دارالحکومت لکھنؤ کے ساتھ مخصوص ہوگئیں ایک اچھوتیاں اور دوسرے شہدے۔ شہدوں سے مراد وہ گروہ ہے جو شادیوں اور ولادت کے موقعوں پر اپنے حق حقوق لڑ جھگڑ کر اور بُرا بھلا کہکر یا تو لوگوں کے مکانوں سے وصول کرتے جاتے ہیں یا جنازوں اور شادیوں کے جلوس کے ہمراہ خیرات اور نچھاور کا روپیہ لُٹنے میں جھولے باندھ کر اچک بچھا ندھ کر اور گھس پل کر لوٹا کرتے ہیں اور حسب ضرورت دشنام دہی سے بھی کام لیتے ہیں۔ مگر لوگ ان کی زبان درازی اور زشت گوئی کو محبوب کی گالی سمجھ کر سنتے ہیں اور ہنس کر ٹال دیتے ہیں نہ کبھی اُن سے باز پرس کرتے ہیں نہ ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتے ہیں اس طور پر شہدوں کا گالیاں دینا گویا ان کا قدیمی اور موروثی حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اچھوتیاں تخمیناً سوا صدی قبل شاہ نصیر الدین حیدر کے دم قدم سے ظہور میں آئیں اور انھیں کے اختراعی دماغ کا نتیجہ تھیں مگر مذہبی نقطۂ نظر سے چونکہ لوگ اچھوتیوں کے قیام کو ایک بدعتی امر خیال کرتے تھے اس لئے اپنے بانی ہی کے دم کے ساتھ وہ ختم بھی ہوگئیں مگر شہدے بقول مرزا ابو طالب مصنف "تفضیح الغافلین" امیر الدولہ نواب حیدر بیگ خاں نائب آصف الدولہ کے طرز عمل سے وجود میں آئے تھے اپنی قدیمی روش کو لئے ہوئے اب تک شہر لکھنؤ میں موجود ہیں۔

اچھوتیوں کی بنیاد یوں پڑی کہ شاہ نصیر الدین حیدر کے مزاج میں مذہبی غلو بہت تھا۔ چنانچہ عنانِ حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد انھوں نے عشرۂ محرم کی عزاداری کو ترقی دے کر اربعین تک رائج کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے سیدوں کی بارہ کمسن و کنواری حسین و مہ جبین لڑکیاں منتخب کر کے اُن کو اماموں سے منسوب کر کے اچھوتیوں کا خطاب عطا کیا اور جب کسی لڑکی کے والدین اپنی دنیوی فلاح و بہبود کے پیش نظر اپنی لڑکی کو اچھوتی قرار دینے کو رضامند ہو جاتے تھے اور بادشاہ سے عہد و پیمان کر لیتے تھے کہ اُس کی شادی خانہ آبادی کا کبھی نام تک نہ لیں گے تو ان کی دختر "اچھوتی قرار پاکر کسی امام عالی مقام کی زوجیت سے مفتخر و ممتاز کر دی جاتی تھی۔ بادشاہ ان اچھوتیوں کو نہایت عیش و آرام سے رکھتے تھے نفیس اور قیمتی پوشاکیں پہناتے۔ سونے کے جڑاؤ خوشنما زیورات سے ان کو آراستہ کرتے اور ان کے والدین اور اعزہ کے ساتھ بہت حُسن سلوک سے پیش آتے۔ ابتداً یہ اچھوتیاں اکبری دروازہ سے کشمیری محلہ کو جاتے ہوئے پل غلام حسین سے متصل بائیں جانب ایک گلی میں رہتی تھیں جس کا نام اب تک "کوچۂ اچھوتیاں" یا "اچھوتیوں والی گلی" مشہور ہے۔ اچھوتیاں اس محلہ میں ایک امام باڑے میں قیام پذیر تھیں اور اسی میں بادشاہ کے صرف سے تعزیہ داری بھی کرتی تھیں۔ بادشاہ نذر و نیاز کا کل کھانا انھیں اچھوتیوں کی نذر کرتے تھے اور "صحنک دانہ" جسے "بیوی کی نذر کا کھانا" بھی کہتے ہیں۔ انھیں اچھوتیوں کو پیش کش کرتے تھے۔

"صحنک" میں زیادہ تر دہی اور خشکہ ہوتا تھا اس سے اتر کر پوری قیمہ، پھر نذر دلانے والے کے حسب پسند کچھ ماکولات ہوتے تھے، مابعد بادشاہ نے اچھوتیوں کے لئے ایک عالیشان عمارت قریب چھتر منزل اندرون شیر دروازہ (حال نیل گیٹ تعمیر کرائی جو درگاہ بارہ امام کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ ایوان تعمیر ہونے پر اچھوتیاں اسی میں منتقل ہوگئیں۔

اچھوتیوں کے محل میں سوائے بادشاہ یا مجتہد صاحب کے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ اندر قدم رکھ سکتا۔ اسی محل سے متصل بادشا

نے ایک اور مکان بنوا کر ضروری سامان سے آراستہ کر دیا تھا اچھوتیوں کے عزیز و اقارب جب ان کی ملاقات کے متمنی ہوتے تو اسی مکان میں بلوا کر ان کی زیارت کر لیتے بادشاہ ہر روز صبح کو حسب معمول ہر اچھوتی کی جائے رہائش پر حاضری دیتے۔ اس کے دروازے پر قدم رکھتے ہی تعظیماً ٹوپی یا تاج سر سے اتار ڈالتے اور برہنہ سر اس آستانہ کی تعظیم و تکریم کرتے یعنی کھڑے کھڑے تین تسلیمیں کرتے اور دست بستہ مودب کھڑے ہو جاتے۔ اچھوتیاں بھی نیم قد استادہ ہو کر بادشاہ کی تعظیم و توقیر بجا لاتیں بقول مصنف " دربار اودھ" بادشاہ جو فرمانی پیام اچھوتیوں کی زبانی سنتے ان پر سب سے پہلے کاربند ہوتے تھے زیادہ تر ان اچھوتیوں کے احکام اپنے اعزہ کے مفید مطلب ہوتے تھے اور ان سے اُتر کر مولوی صاحب کی منفعت اور فایدے کے ہوتے تھے یا ان مجرموں کی سفارشیں ہوتی تھیں جن کا سخت جرم بجز امام علیہ السلام کی سفارش کے اور کسی طرح قابل معافی نہیں تصور کیا جاتا تھا مگر اس آخر الذکر معاملہ میں یا تو زیادہ با اثر لوگوں کی سفارشیں کام دیتی تھیں یا بافراط روپیہ صرف کرنے والے اچھوتیوں کو رضامند کر کے انھیں اپنی سفارش کے لئے آمادہ کرتے تھے، مگر ان باتوں کا انجام کیا ہوا شہر میں اندھیر مچا ہوا تھا۔ ہر طرف خانہ جنگیوں کا زور اور شاہی متوسلین کی دست درازیاں اور مظالم غریب کی تباہی اور بربادی جس کی کوئی داد فریاد نہ تھی۔

بماہ اکتوبر ۱۸۳۷ء نصیر الدین حیدر کو زہر دیکر اُن کا کام تمام کر دیا گیا۔ ان کے بعد حضرت محمد علی شاہ اورنگ شاہی پر جلوہ افروز ہوئے انھوں نے کل اچھوتیوں کو جو بہ لقب " حرم دوازدہ امام علیہ السلام" مشہور ہوئی تھیں بالکل آزاد اور خود مختار کر دیا چنانچہ بعض نے اہلکاران شاہی سے عقد کر لیا اور بعض اپنے اپنے گھروں کو راہی ہو گئیں درگاہ امام ۵۷ء کے ہنگامۂ عظیم میں منہدم ہو کر بے نشان ہو گئی۔ اچھوتیوں والی گلی کا امام باڑہ بھی نیرنگیِ عالم سے بالکل ناپید ہو گیا ہے اب فقط نام ہی نام باقی ہے۔

مرزا حبیب علی بیگ سرور نے بھی جو شاہ نصیر الدین حیدر کے ہمعصر تھے اپنی مشہور عالم تصنیف فسانۂ عجائب کے دیباچہ میں درگاہ بارہ امام۔ بادشاہ کے مذہبی انہماک۔ اور ان کی اولوالعزمیوں کی تصویر حسب ذیل الفاظ میں کھینچی ہے:۔

" دوازدہ امام کی درگاہ ایسی بنائی کہ چرخ گردوں کو خواب میں نظر نہ آئی ۔۔۔۔۔ بجز غم حسین شہریار کو اندوہ و غم نہیں۔ کون ہے جو اس زمانہ میں شاد و خرم نہیں۔ اربعین تک عزاداری ہوتی ہے۔ خلق خدا ماتم میں روتی ہے۔ لاکھوں روپیہ اسی راہ میں صرف ہوتا ہے۔ تخم عمل نیک آخرت میں بوتا ہے۔ روز تولد ہر امام و شب وفات جگر بندانِ خیر الانام لاکھوں روپیہ کا صرف ہے۔ اسکی ہمت کے آگے فیاضانِ گزشتہ پر حرف ہے۔"

اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو شمالی ہند کی " اچھوتیاں" جنوبی ہند کی مرسیوں یا دیو داسیوں کا پرتو یا نقش ثانی تھیں۔ دیو داسیوں کے والدین بھی اُن کو کمسنی میں بحالت دوشیزگی کسی دیوتا کو بھینٹ چڑھا کر مندر میں چھوڑ دیا کرتے تھے جس کے بعد وہ زندگی بھر کنواری رہکر اس دیوتا کی سیوا ناچ گا کر یا دوسرے ڈھنگ سے کیا کرتی تھی مگر نتیجہ میں یہ رسم بداخلاقیوں اور بدراہیوں کا سرچشمہ ثابت ہوئی کیونکہ اکثر و بیشتر دیو داسیاں اپنی جوانی کے جوش اور امنگ میں مندروں کے مہنتوں اور پوجاریوں کی خواہشات بیجا کی شکار ہو جاتی تھیں چنانچہ مصلحانِ قوم کو اُن کی جانب توجہ ہوئی اور انھوں نے اس مذموم رسم کو ریاست کوچین سے جہاں یہ طریقہ بہت عام تھا نیز دیگر صوبوں سے بزور قانون بند کرا دیا۔

مصنف " دربار اودھ" نے بھی مہ پارہ نامی ایک اچھوتی کی کجروی اور آوارگی کی ایک نہایت درد انگیز اور عبرتناک داستان بیان کی ہے جس کے واقعات مختصراً یہ ہیں:۔

منے مرزا اور غفور مرزا کے آپس کے جھگڑے بکھیڑوں کا شہر لکھنؤ میں بہت چرچا تھا۔ غفور مرزا کی بہن مہ پارہ بھی ایک امام کی اچھوتی تھی مگر سب اچھوتیوں سے زیادہ ممتاز اور با اثر تھی منے مرزا کی بہن خورشید سیما تھی جس کے والدین اُس کی خورد سالی میں فنا کر گئے تھے اُس کی پرورش اُس کے بڑے بھائی منے مرزا نے کی تھی اتفاقاً ایک روز بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی جس پر اُس کے عشق

کی آگ دفعتہً اُن کے دل میں بھڑک اُٹھی اسی تعلق خاطر سے اُس کا محل ہوگیا لیکن خورشید سیمانے غفور مرزا کے خلاف بادشاہ کے کان بھر دئے اُس کے بعد مہ پارہ نے جو منے مرزا کی شکایت جہاں پناہ سے کی وہ بے اثر رہی اس لئے جناب مولوی صاحب کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ دونوں میں مصالحت کرا کے اس قضیہ کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے چنانچہ مہپارہ نے منے مرزا کو پڑوس کے مکان میں بلا کر دونوں میں صفائی کرا دی دونوں اُس روز دودھ جاول ایک ساتھ کھا کر اور تلواریں بدل کر تلوار بدل بھائی ہو گئے مگر مہپارہ نے منے مرزا کو چلمن کی آڑ سے جو دیکھا تو اُن کے مردانہ حُسن اور کسرتی بدن پر اس کی رال ٹپک پڑی اور پہلی ہی نظر میں نقد دل اُن کی نذر کر دیا چنانچہ اُس نے کمال عیاری اور بناوٹ سے اُسی وقت ان کو اپنے جمال جہانتاب کی بھی جھلک دکھا دی۔ منے مرزا بھی اُس کا چاند سا مکھڑا اور سانچہ میں ڈھلا ہوا گول اور سڈول جسم دیکھ کر اس پر لٹو ہو گئے چنانچہ جب ہر دو فریق آتش محبت سے جلنے لگے تو مہ پارہ نے اپنی آزادی کی صورت اس طرح پیدا کی کہ ایک مرتبہ جو بادشاہ حسب معمول صبح کو اُس کی قیام گاہ پر آئے تو دیکھا کہ وہ منہ تھوتھائے سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھی ہوئی ہے جب بادشاہ نے اُس کی پریشان حالی کا سبب دریافت کیا تو مہپارہ نے منہ کو دونوں ہاتھوں سے پیٹ کر کہا "ہائے میرا راج سہاگ لٹ گیا میں تو کہیں کی نہ رہی ہائے میرا وارث مجھ سے چھٹ گیا" بادشاہ نے بدحواس ہو کر کہا "صاحب کچھ بیان تو کرو آخر کیا معاملہ ہے" اس پر مہ پارہ نے جواب دیا "ہائے مجھ سے حضرت کل شب کو خفا ہو کر طلاق دے گئے" اس پر بادشاہ نے دریافت کیا "آخر تم سے کون سی بے ادبی اُن کی جناب میں ہوئی" مہ پارہ بولی "نہ کوئی گستاخی ہوئی نہ کوئی خطا ہی سرزد ہوئی حضرت خود بخود خفا ہو گئے اور جاتے وقت فرما گئے کہ میں نے تجھ کو طلاق دی تو آج ہی اس محل سے نکل جا اور اپنا مہر بادشاہ سے وصول کر لے اگر تو کل شب کو یہاں قیام کرے گی تو صبح کو تیرا جنازہ نکلے گا"

مہ پارہ کی گفتگو سُن کر بادشاہ بہت سٹ پٹائے اور فوراً مولوی صاحب قبلہ کو طلب کیا۔ مولوی صاحب بلا تاخیر تشریف لے آئے جب انھیں مہ پارہ کی کیفیت معلوم ہوئی تو کھٹکا پیدا ہوا کہ کہیں اپنی حصول آزادی کے لئے بادشاہ سے یہ نہ کہدے کہ ائمہ علیہ السلام کے ساتھ جو سلسلہ تزویج قایم کیا گیا ہے وہ بالکل فرضی ہے اور جو حکم احکام پہونچائے جاتے ہیں وہ میرے ساختہ و پرداختہ ہوتے ہیں اس خیال کے آتے ہی جناب مولوی صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور بادشاہ کے سامنے بالکل مبہوت بنے کھڑے رہے بادشاہ نے خود سکوت کو خود توڑا اور مولوی صاحب سے دریافت کیا کیا جناب کو بھی مہ پارہ کی طلاق کی خبر پہونچ گئی مولوی صاحب نے جواب دیا "مجھے تو یہاں آنے پر یہ ساری کیفیت معلوم ہوئی میں اس کی نسبت اس وقت کچھ عرض کر سکتا ہوں جب مجھے تخلیہ میں مہ پارہ سے رد و بدل باتیں کرنے کی اجازت دی جائے بادشاہ نے اجازت دے دی۔

مولوی صاحب مہ پارہ سے تنہائی میں گفتگو کرنے لگے۔ اثناء گفتگو میں مہ پارہ نے مولوی صاحب کو دھمکی دی کہ اگر آپ میرے مہر کا پانچ لاکھ روپیہ دلوانے میں ذرا بھی تامل کریں گے تو آپ کا سارا بھانڈا پھوڑ دوں گی یہ سُن کر مولوی صاحب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ---- اور بہت قیل و قال کے بعد اپنے حق کے ۲۵ ہزار روپے طے کر کے اور مہ پارہ سے بقسمیہ وعدہ لیکر کہ میں آپ کے کل رازوں پر پردہ ڈالے رکھوں گی بادشاہ کو مشورہ دیدیا کہ واقعی حضرت مہ پارہ سے ناراض ہو کر اُس کو طلاق دے گئے لہذا آج ہی اس کو پانچ لاکھ روپے بابت مہر اور محل کا ساز و سامان دے کر رخصت کر دیا جائے۔

بادشاہ نے دونوں باتیں منظور کر لیں زر مہر بھی ادا کر دیا اور کل اسباب بھی مہ پارہ لدوا کر لے گئی۔

درگاہ بارہ امام سے واپس آنے کے بعد مہ پارہ نے منتی گنج میں ایک عالیشان مکان خریدا اور وہیں امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرنے لگی۔ منے مرزا روزمرہ مہ پارہ کے مکان پر آتے جاتے تھے گو بظاہر انھیں غفور مرزا سے ملنے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا جو اب اپنی بہن کے ہمراہ رہتا تھا مگر دراصل وہ محض مہ پارہ کے اشتیاق میں جایا کرتے تھے۔

مہ پارہ کا باپ اُس کی خورد سالی میں مر چکا تھا صرف اس کی ماں بقید حیات تھی جو اب مہ پارہ ہی کے ساتھ رہتی تھی مگر چونکہ مہ پارہ

نے ذاتی کوشش سے دولت پیدا کی تھی اس لئے اُس کی ماں کا اس پر مطلق اثر نہ تھا اسکے بعد منے مرزا کی بہن خورشید سیما نے بادشاہ کا عندیہ لیکر منے مرزا کا عقد مہ پارہ سے کرا دیا۔ کچھ دن قبل محبت سے گزرنے کے بعد مہ پارہ نے نورا بھانڈ کے لڑکے دولہ بھانڈ کو مجرا کرتے دیکھا تو اس پر لہٹوٹ ہوگئی اور اپنی ملازمہ لاڈو کی معرفت دولہ کو پردہ دار ڈولی میں بلایا کرتی اور یہ ظاہر کرتی کہ ایک اچھوتی کی بہن میری ملاقات کو آتی ہیں۔ اپنے شوق کی تکمیل کے لئے مہ پارہ نے دولہ کے ساتھ ہزار ہا روپیہ کا سلوک کیا جس سے وہ نہایت مالا مال ہوگیا۔ دولہ کی آمد و رفت کا یہ طریقہ جاری تھا کہ نواب جعفر مرزا پسر بخارا کے ایک نو دولت مند امیر کو مہ پارہ کے یہاں اُس کی آمد و رفت کی سُن گن مل گئی۔ چونکہ وہ مہ پارہ کے حُسن و جمال کا شہرہ سُن کر اُس کے نادیدہ عاشق ہو چکے تھے اس لئے انھوں نے بھی لاڈو کو روپیہ کا لالچ دیکر ایک روز ترکیب سے دولہ کو گرفتار کرکے اپنے گھر میں بند کر دیا اور خود اُس کی ڈولی میں بیٹھ کر مہ پارہ کے مکان میں داخل ہوگئے جب مہ پارہ نے دولہ کے بجائے جعفر مرزا کو دیکھا تو ٹھگ ماری سی ہوگئی مگر اپنے تئیں سنبھال کر اپنی گلو خلاصی کی تدبیریں سوچنے لگی اسی اثنا میں منے مرزا مکان میں داخل ہوئے جس پر جعفر مرزا کے ہوش و حواس غائب ہوگئے اور بہ عجلت تمام جس چور دروازہ سے مکان میں داخل ہوئے تھے اسی راہ سے ڈولی میں بیٹھ کر فوراً رفو چکر ہوگئے مگر گھبراہٹ میں جوتا وہیں رہ گیا۔ منے مرزا نے مردانہ جوتا دیکھ کر اس کے متعلق تحقیقات کی جب اُن کو کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا تو مہ پارہ کی پاکدامنی میں طرح طرح کے شکوک اُن کے دل میں پیدا ہوئے مہ پارہ نے اپنی عیب پوشی کے لئے منے مرزا کا منہ موت سے بند کرنا چاہا اور ان کی کچنی میں زہر ملا دیا۔ منے مرزا کو زہر کے اثر سے جیسے ہی خون کی پہلی قے آئی انھوں نے اپنے تئیں سنبھال کر جب تک سکت باقی رہی تین خطوط تحریر کئے اُس کے بعد جاں بحق ہوگئے پہلا خط تو اپنی بہن خورشید سیما کو لکھا کہ میرے بعد میری کل جایداد زائرین کربلائے معلیٰ کو بطور زادِ راہ دیدی جائے، مہ پارہ کو اُس میں سے ایک حبہ نہ دیا جائے۔ دوسرا اپنے ایک شناسا ڈاکو محمد و کو لکھا کہ مجھے اپنی بیوی کی بدکاری کا کامل یقین ہوگیا ہے تم میری قاتلہ کو خوب لوٹنا اور اس کے ستانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھنا۔ جیتے جی اُس کا پیچھا چھوڑنا اُس کی آوارگی کو تمام شہر میں الم نشرح کر دینا۔ اپنے استاد قاسم علی کی مدد لینا اور مکان میں بیس ہزار روپئے مدفون ہیں موقع پاکر یہ رقم بطور صلہ نکال لے جانا۔ تیسرا ایک منی طوائف کو لکھا جس کی لڑکی مسماۃ پیاری کو غفور مرزا نے قبل ازیں تہ تیغ کر دیا تھا مگر منے مرزا کی سعی و حمایت سے بچ گئے تھے اس خط میں منے مرزا نے مکان کے اُس حصہ کا پتہ بھی بتا دیا جس میں غفور مرزا کے خون آلود کپڑے دفن تھے نیز یہ تحریر کیا کہ یہ خط اپنے ضمیر کی ملامت کرنے پر تحریر کر رہا ہوں کہ ایک قاتل کی بیجا پشت پناہی کیوں کی۔

اس خط کو پاکر منی نے نشاندہی کرکے غفور مرزا کے کپڑے زمین سے کھدوا کر برآمد کرا دئے جس پر وہ گرفتار ہوکر کیفر کردار کو پہونچے۔

منے مرزا کی رحلت کے بعد جب مہ پارہ کو بالکل اطمینان ہوگیا اور اُس کے بھائی غفور مرزا بھی قید ہوگئے تو وہ کھل کھیلی اب اُسکے راستہ میں کوئی کانٹا نہ رہا تو اُس نے پھر دولہ کو بلانا شروع کر دیا ایک روز شب کو دولہ مہ پارہ ہی کے یہاں موجود تھا کہ اُس کے مکان میں زبردست ڈاکہ پڑا کئی لاکھ روپئے کا مال و اسباب ڈاکو اُٹھا لے گئے ظالموں نے گھر کی ایسی صفائی کی کہ جھاڑو تک نہ چھوڑی۔ مہ پارہ اپنے گھر کی طرف متوجہ ہوئی تو اسے منے مرزا کے ساتھ بیوفائی کرنے پر سخت تاسف ہوا۔ نیز اُس کا خیال منے مرزا کے خط کے اس جملہ پر جم گیا جو انھوں نے اپنی بہن کو لکھا تھا کہ میں مہ پارہ سے خوش نہیں ہوں خدا اُسے بہت جلد تباہ کر دے گا اور وہ وقت بہت قریب آنے والا ہے جب اُس کی حالت ایک بازاری بھکارن سے بدتر ہو جائے گی۔ اس جملہ کا خیال آتے ہی اُس کو یقین ہوگیا کہ میری تباہی و بربادی کی کوئی تدبیر منے مرزا ہی کر گئے ہوں گے جس طرح وہ میرے بھائی کو پھنسانے کی فکر کر گئے۔

جس وقت جعفر مرزا کو مہ پارہ کے لٹنے کی خبر پہونچی وہ اپنے دل میں نہایت خوش ہوئے۔ اُس کی تباہی سے اُنھوں نے خیال کیا کہ اب مہ پارہ میرے قابو میں آسانی سے آجائے گی اور میری ہی ہو کے رہے گی اس خیال کے آتے ہی خوشی کے مارے اُن کی باچھیں کھل گئیں۔ اسی مصلحت سے وہ مہ پارہ کے اس آڑے وقت میں بہت کام آئے اور کل سامان زیور جواہر۔ برتن باسن۔ فرش فروش نہایت دریا دلی سے فراہم کر دیا۔ اب جعفر مرزا کی آمد و رفت مہ پارہ کے مکان پر چوری چھپے ہونے لگی۔ ایک روز شب کو وہ مہ پارہ کے یہاں بلا شرکت

غیرے اس پر قابض تھے کہ چند مسلح اشخاص مکان میں گھس آئے جعفر مرزا خوفزدہ ہوکر تھر تھر کانپنے لگے اور سہم کر مسہری کے نیچے گھس گئے مگر ڈاکوؤں نے تلوار کے ایک ہلکے سے ٹھوکے سے انھیں باہر نکال لیا اور مہ پارہ اور جعفر مرزا کے منھ پر پٹیاں باندھ کر اور دونوں کو ایک رسی سے کس کر صحن مکان میں لے آئے پھر مکان کے تینوں کونوں میں آگ لگا کر باہر نکل گئے۔ آگ کے شعلے بلند ہونے سے اہل محلہ جاگ اٹھے اور آگ بجھانے کے لئے چاروں طرف سے دوڑ پڑے، سبھوں نے مہ پارہ اور جعفر مرزا کو ایک ہی رسی میں بندھے ہونے کا عبرتناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جعفر مرزا کے خدمتگار فضلے نے جس کو جعفر مرزا کے گھر میں ہونے کا اچھی طرح علم تھا دونوں کو اپنے ہاتھ سے کھولا۔ اس وقت سیکڑوں آدمی گھر میں موجود تھے، جعفر مرزا نے آزاد ہوتے ہی نکل جانے کی کوشش کی مگر مہ پارہ نے اُن کا ہاتھ تھام کر کہا کہ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو اب میں اہل محلہ کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہی، چنانچہ جعفر مرزا کے اشارہ پر فضلے، مہ پارہ کو اُن کے عشرت کدہ پر لے آیا۔ فضلے نے اب مہ پارہ کو بے پردہ جو دیکھا تو وہ بھی اُس پر ہزار جان سے فریفتہ ہوگیا۔

جس شب کو مہ پارہ، جعفر مرزا کی دولتسرا پر پہونچی اس کی صبح کو جعفر مرزا پر ایک اطلاعنامہ محکمۂ وزارت کا تعمیل ہوا جس سے واضح ہوا کہ اُن کی ماں نے دعویٰ کیا تھا کہ جعفر مرزا میرے شوہر کا صلبی بیٹا نہیں ہے اب اُس کے اطوار بالکل ناپسندیدہ ہوگئے ہیں میرے شوہر کی جایداد بالکل تباہ کئے دیتا ہے اس لئے اُس سے کل جائداد لے کر میرے شوہر کے سگے بھتیجے نواب عسکری مرزا کو دلوادی جائے۔ جعفر مرزا کو مقدمہ میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ اس آڑے وقت میں جعفر مرزا کا کسی نے ساتھ نہ دیا اپنے پرائے سب منھ موڑ گئے۔ چنانچہ لاچار ہوکر اپنے خسر سلیمان مرزا کے یہاں جاکر اُن کی روٹیوں پر پڑے۔ اُن کی بیوی نے جن کے ساتھ ہمیشہ لاپرواہی اور بے اعتنائی سے پیش آتے تھے اس دور ابتلا میں اُن کا بہت ساتھ دیا اور دل وجان سے اُن کی رفاقت کرتی رہیں۔

اس اثنا میں مہ پارہ کی ضعیف ماں نے رسوائیوں کا شہرہ سُن کر افیون کھالی اور جان عزیز جان آفریں کے سپرد کردی۔ مقدمہ ہار کر جعفر مرزا نے مہ پارہ سے کہلا بھیجا کہ اب مجھ میں اتنی استطاعت نہیں جو آپ کے مصارف کا متحمل ہوسکوں لہٰذا آپ اپنا کوئی انتظام بطور خود کر لیجئے۔ یہ پیغام سنکر مہ پارہ کے ہوش بجا نہ رہے۔ اب سوائے میاں فضلے کے اُن کا کوئی قدردان اور یار و مددگار نہ تھا۔ چار و ناچار میاں فضلے کے گھر میں آکر پڑیں۔ فضلے کی بڑھیا ماں خوب سمجھتی تھی کہ یہ ہری ٹہنی پر بیٹھنے والی ہرگز وفا نہ کرے گی چنانچہ اُن کا خیال صحیح ثابت ہوا۔ فضلے کے یہاں سے بی مہ پارہ کو ان کے ایک یار غار اُڑا لے گئے۔ آخر یوں ہی در در کی ٹھوکریں کھاکر اور اپنی سیہ کاریوں اور بداعمالیوں کی سزا بھگت کر وہ لقمۂ اجل ہوگئی۔

(قومی آواز) تصدق حسین بی۔اے۔ال۔ال۔بی

تصانیف نیاز فتحپوری

(رعایتی قیمت) (رعایتی قیمت)

من و یزداں کامل ۔۔۔ مذہبی استفسارات وجوابات ۔۔۔ جمالستان ۔۔۔ نگارستان ۔۔۔ شہوانیات ۔۔۔

مکتوبات نیاز تین حصے ۔۔۔ انتقادیات ۔۔۔ حسن کی عیاریاں ۔۔۔ مالہ وماعلیہ ۔۔۔ شہاب کی سرگزشت ۔۔۔

فلاسفۂ قدیم ۔۔۔ مقالات نیاز ۔۔۔ فراست الید ۔۔۔ مذہب ۔۔۔ نقاب اُٹھ جانے کے بعد ۔۔۔

جذبات بھاشا ۔۔۔ شاعر کا انجام =

میزان

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں اخیر جولائی ۵۴ء تک۔

منیجر نگار لکھنؤ

پہلی صدی ہجری میں عربوں کا دوسری اقوام سے اختلاط

رسول اکرمؐ کے زمانہ تک اسلام جزیرۃ العرب تک محدود تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اسلامی فتوحات کا دائرہ نہایت تیزی کے ساتھ وسیع ہوا اور قلیل عرصہ میں عراق، فارس، شام اور مصر اسلامی قلمرو میں شامل ہو گئے۔ ان ممالک میں عموماً مخلوط آبادی تھی اور زمانۂ گزشتہ میں یہ ممالک مختلف تہذیبوں کے زیر اثر رہ چکے تھے۔ عراق میں اصلی باشندوں کے علاوہ چند عربی قبایل مثلاً ربیعہ مضر اور کچھ فارسی النسل لوگ جن کا مذہب زردشتی اور مزدکی تھا آباد تھے۔

عراق کی آب و ہوا دیگر ممالک کے مقابلہ میں عربوں کے لئے زیادہ موافق تھی، اس لئے بصرہ و کوفہ، فوجی قیام گاہ کے لئے منتخب کئے گئے۔

فارس کی آبادی بھی زیادہ تر فارسی النسل لوگوں اور کچھ رومیوں پر جو رومیوں اور ایرانیوں کے جنگ کے دوران میں گرفتار ہوئے تھے اور کچھ یہودیوں پر مشتمل تھی۔

شام گزشتہ زمانہ میں مختلف متمدن اقوام مثلاً فنیقیوں، اموریوں، کنعانیوں، یونانیوں اور رومیوں کے قبضے میں تھا۔ چونکہ شام آخر زمانہ میں رومیوں کے زیر نگیں تھا اس لئے اس زمانہ میں شام میں رومی تہذیب کا زیادہ اثر تھا۔ یہاں کے اصل باشندے زیادہ تر عیسائی مذہب کے پیرو تھے۔

اصل باشندوں کے علاوہ شام میں یہودی، رومی اور بعض عربی قبایل مثلاً غسان، لخم، جذام، کلب، قضاعہ، تغلب وغیرہ آباد تھے۔ عربی قبائل زیادہ تر جنوبی شام میں سکونت پذیر تھے کیونکہ شام کا جنوبی حصہ عربوں کے ملک سے قریب تر تھا۔ یہ لوگ مخلوط عربی اور آرامی زبان بولتے تھے اور لڑائیوں میں ان عربوں کے خلاف رومیوں کے شریک تھے۔

مصر بھی قدیم زمانے میں یونانی و رومی تہذیب کے زیر اثر تھا خصوصاً اسکندریہ مختلف فلسفی مذاہب اور دینی گروہ کا مرکز اور غربی و شرقی خیالات کی جائے اختلاط تھا۔ اس ملک میں مصری، رومی اور یہودی باہم مخلوط تھے۔

مذکورہ بالا ممالک کے علاوہ اس زمانہ میں دیگر مقامات مثلاً برقہ اور جبل طارق کے درے جو رومیوں کے قبضے میں تھے۔ مسلمانوں نے فتح کئے یہاں تک کہ ولید ابن عبدالملک کے زمانہ میں سندھ، بخارا، خوارزم اور سمرقند سے لیکر کاشغر تک اسلامی سلطنت قایم ہوئی۔ اور اندلس بھی اسلامی قلمرو میں شامل ہو گیا لیکن شروع دور میں عربوں پر آخر الذکر فتوحات کا کوئی نمایاں قابلِ ذکر اثر نہیں ہوا۔ شروع دور میں اول الذکر چار ممالک کے فتوحات سے مسلمانوں کی دینی اور ذہنی حالت پر جو اثر ہوا اس کے اہم اسباب حسب ذیل ہیں:-

فتوحات کے متعلق اسلامی تعلیم اور ہدایات کا اثر

جب مسلمان کسی ملک پر حملہ کرنے کا ارادہ کرتے تھے تو حملے سے پہلے اسلامی تعلیم کے مطابق ملک کے سامنے دو شرطیں پیش کرتے تھے۔ پہلی شرط تو قبول اسلام تھی۔ اس شرط کو منظور کرنے کی صورت میں یہاں کے باشندوں کے دیگر مسلمانوں کی طرح مساوی حقوق حاصل ہو جاتے تھے۔ اگر دعوتِ اسلام رد کرتے تو دوسری شرط یہ پیش کی جاتی تھی کہ بغیر جنگ کے اپنے ملک کو مسلمانوں کے

سپرد کر دیں اور مسلمانوں کو جزیہ ادا کریں۔ اس شرط کو قبول کرنے کی حالت میں یہاں کے باشندے مسلمانوں کے نفع نقصان میں شریک سمجھے جاتے تھے اور ان کی جان و مال کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ تھی۔ یہ لوگ اہل الذمہ یا ذمی کہلاتے تھے۔ ان دونوں شرائط کے رد کرنے کی حالت میں مسلمانوں کو ان کے ملک پر حملہ کرنے کا اختیار تھا۔ اگر دورانِ جنگ میں لوگ صلح کے خواہاں ہوتے تو کلام مجید کی آیت "ان جنحوا للسلم فاجنح لھا" (یعنی اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھکو) کے مطابق عمل کیا جاتا۔

اسیرانِ جنگ کے متعلق امام کو اختیار تھا، چاہے فدیہ لیکر چھوڑ دے، چاہے ان کو غلام بنائے۔ بہر حال مقتضائے حالات کے بنا پر قتل کرنا۔ غلام بنانا، آزاد کرنا، فدیہ لینا امام پر منحصر تھا۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عموماً اسیرانِ جنگ کے ساتھ نیک سلوک کیا جاتا تھا۔

عمر ابن عبدالعزیز کے دوران خلافت میں صرف ایک ترک قیدی قتل کیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ قیدی آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو حاضرین نے آپ سے کہا کہ اگر آپ اس شخص کو مسلمانوں کے قتل پر لوگوں کو آمادہ کرتے دیکھتے تو آپ کے آنسو کبھی نہ رکتے۔ چنانچہ یہ سُن کر عمر ان عبدالعزیز نے فرمایا کہ اس کو لے جاؤ تم کو اختیار ہے جو جی چاہے کرو۔

حضرت عمر جو اس قسم کے مسایل کے خاص مرجع خیال کئے جاتے ہیں ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ انھوں نے سوادِ عراق کے باشندوں کو آزاد کر دیا تھا۔ بہر حال اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسیرانِ جنگ پر احسان بھی کیا گیا اور غلام بھی بنائے گئے۔ لیکن اسلام کی غلامی کی نوعیت دیگر اقوام کی غلامی سے مختلف تھی۔

غلامی، اسلام سے پہلے بھی قریب قریب ہر ملک اور ہر قوم میں تھی۔ مختلف اقوام و ملک میں مختلف قاعدے تھے۔ یہودی مذہب کے مطابق غلامی کا زمانہ آٹھ سال تھا اس کے بعد وہ آزاد ہو جاتا تھا۔

یونانیوں کے غلاموں کی بھی طویل داستان ہے۔ رومی قانون کے مطابق مالک غلام کی زیست و حیات کا کلی مختار تھا۔ کسی کو غلام کے سلوک کے متعلق مالک سے سوال کرنے کا حق نہ تھا۔ مورخین کے مطابق رومی شہروں میں غلاموں کی تعداد آزادوں کے مقابلہ میں تگنی تھی۔ زمانۂ جاہلیتہ میں جب عربوں میں آپس میں لڑائی ہوتی تھی تو فاتح فریق مفتوحہ فریق کے مرد۔ بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے غلام بنا لیتے تھے اور ان کو باقاعدہ بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ چنانچہ غلاموں کی خرید و فروخت کے مخصوص بازار تھے۔ اسد الغابہ میں زید ابن حارثہ مولیٰ رسول اللہ کے متعلق تحریر ہے کہ وہ قبیلہ بنی قضاعہ سے تھے اور ان کی والدہ قبیلہ بنی طے سے تھیں۔ جب ان کی والدہ قبیلہ بنو معن سے ملنے جا رہی تھیں تو راستہ میں بنی نضیر بن جسر کے قبیلہ نے ان پر حملہ کیا اور زید ابن حارثہ کو گرفتار کر کے عکاظ کے بازار میں فروخت کرنے لے گئے۔ حکیم ابن حزام نے ان کو اپنی چچی خدیجہ بنت خویلد کے لئے خرید لیا۔ خدیجہ بنت خویلد نے رسول اللہ سے شادی کے بعد ان کو رسول اکرم کو دیدیا۔ رسول مقبول نے ان کو آزاد کر دیا۔

حضرت علی نے بیان کیا کہ صلح حدیبیہ سے قبل کچھ غلام مکہ سے رسول اکرم کے پاس بھاگ آئے ان غلاموں کے مالکوں نے رسول اکرم کو پیغام بھیجا کہ یہ لوگ اسلام سے خلوص عقیدت کی وجہ سے نہیں بلکہ غلامی سے بچنے کے لئے آپ کے پاس بھاگ گئے ہیں چنانچہ چند لوگوں نے رسول اکرم کو مشورہ دیا کہ ان کو ان کے مالکوں کے پاس واپس کر دیا جائے۔ رسول اللہ کو یہ مشورہ ناگوار خاطر ہوا اور آپ نے ان واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

مذکورہ بالا واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ غلامی کی رسم زمانۂ جاہلیت میں تھی اور رسول کے زمانہ میں بھی رائج تھی۔ جزیرۃ العرب میں عربوں کے علاوہ دیگر اقوام کے غلام بھی موجود تھے۔ چنانچہ مشہور صحابہ بلال حبشی۔ سلمان فارسی۔ صہیب رومی یہ سب غلام تھے۔ جب رسول اکرم کی وفات کے بعد اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو اسیرانِ جنگ کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا جس کا نتیجہ غلاموں اور لونڈیوں کی کثرت ہوئی۔ چنانچہ جملہ فاتحین کے حصہ میں متعدد لونڈی و غلام آئے۔ لونڈیوں سے اولادیں بھی ہوئیں

اولاد والی لونڈیاں " ام الولد" کے نام سے موسوم ہوئیں - مالک کی وفات کے بعد یہ لونڈیاں آزاد ہوجاتی تھیں۔

اسلام نے غلاموں کے سلوک کے متعلق خاص ہدایات کی ہیں جس کی وجہ سے غلام کا آزاد کرنا قریب قریب واجب ہوجاتا ہے - غلام کا آزاد کرنا گناہوں کا بہترین کفارہ قرار دیا گیا ہے۔

مالک اور آزاد غلام میں ایک رشتہ البتہ قایم رہتا تھا جس کو " ولاء " کہتے تھے چنانچہ آزاد کنندہ اور آزاد کردہ اس باہمی رشتہ سے منسوب کئے جاتے تھے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ولاء کا تعلق غلامی سے بالکل نہ تھا۔ بلکہ اس زمانہ میں ولاء کے معنی قریبی رشتہ دار۔ چچا کے وارث اور حلیف تھے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں خداوند تعالیٰ کے قول " ولکل جعلنا موالی " میں موالی کے معنی ابن زید کے حوالے سے عصبہ کے لکھے ہیں اور زمانۂ جاہلیت میں مولیٰ اسی معنی میں استعمال ہوتا تھا۔

جب عرب وعجم میں باہمی اختلاط ہوا تو غیر عرب کے لئے کوئی خاص نام نہ تھا۔ لفظ عجم بذات خود توہین آمیز معلوم ہوتا تھا چنانچہ خداوند تعالیٰ کے اس قول کے مطابق " فان لم تعلموا اباءہم فاخوانکم فی الدین ومواليكم " ان کو موالی کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چنانچہ موالی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو وہ جو وارث ہوتا ہے اور جس کے دوسرے وارث ہوتے ہیں یعنی قریبی رشتہ دار وغیرہ۔ دوسرے وہ موالی جن کے دوسرے لوگ وارث ہوسکتے ہیں مگر وہ خود کسی کے وارث نہیں ہوسکتے یعنی آزاد کردہ غلام۔ جب آزاد غلاموں کی تعداد بڑھی اور آزاد کنندہ اور آزاد کردہ میں باہمی رشتہ قایم ہوا تو عام طریقہ سے آزاد کردہ غلام کے معنوں میں مولیٰ استعمال ہونے لگا۔ مولیٰ آزاد کنندہ کے ساتھ لڑائیوں میں اور ان کے دیگر کاموں میں شریک ہوتے تھے اور دل میں باہمی قبیلہ وارانہ تعصب بھی پایا جاتا ہے۔

جب حضرت عمر کے زمانہ میں فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور بہت سے ممالک جنگ کے بعد فتح ہوئے تو اسیرانِ جنگ کی تعداد بہت بڑھ گئی اور قریب قریب ہر فوجی کے حصہ میں لونڈی وغلام آئے جو ان کی خدمت کرتے تھے - لونڈیاں عموماً ام الولد تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربی گھرانوں میں رومی، شامی - مصری، بربری عنصر داخل ہوگیا - اور بہت کم خاندان خالص عربی خاندان رہ گئے عموماً اولاد باپ کی طرف سے تو عربی النسل ہوتی تھی اور ماں کی طرف سے مخلوط النسل تھی - چنانچہ عرب مخلوط النسل ہونے لگے جس کو بعض لوگ ناپسند کرتے تھے - اسیرانِ جنگ میں اچھے خاندان کی عورتیں بھی محاربین کے حصے میں آئیں - زمخشری اپنی کتاب ربیع الابرار میں لکھتا ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں فارس کے اسیرانِ جنگ میں یزدجرد شاہ فارس کی بیٹیاں بھی تھیں جنکو حضرت علی نے لیکر ایک اپنے صاحبزادے حسین، ایک عبداللہ ابن عمر اور ایک محمد ابن ابوبکر کو دیدیں - حسین سے، علی ابن حسین الموسوم بہ امام زین العابدین، عبداللہ ابن عمر سے سالم اور محمد ابن ابوبکر سے قاسم پیدا ہوئے۔ زہد وورع میں یہ لوگ اہلِ مدینہ کے فایق اور مشہور لوگوں میں شمار کئے گئے ہیں - ان لوگوں کی شہرت کی وجہ سے لونڈیوں کی اولاد کی عزت بڑھ گئی۔

بہر حال مختلف زمانہ میں موالی کے ساتھ مختلف طریقے سے سلوک کیا جاتا تھا، چنانچہ موالی کا بھی مختلف ردِ عمل رہا بعض مورخین کا خیال ہے کہ بنوامیہ کے زمانہ میں موالی بری نگاہ سے دیکھے جاتے تھے جس کی وجہ سے بنوامیہ کے خلاف موالی نے شورشوں میں حصہ لیا مثلاً مختار کی بغاوت میں کثیر تعداد شامل تھی۔

ممالک مفتوحہ کے شمول سے عربوں پر اثر

مذکورۂ بالا سبب کے علاوہ عربوں کے دیگر اقوام سے اختلاط کے اور بھی اسباب تھے - مثلاً مفتوحہ ممالک کے باشندے اسلام قبول کرکے عربوں میں گھل مل گئے بلاذری اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھتا ہے کہ پرویز نے چار ہزار اپنی مدد کے لئے طلب کیا۔ یہ لوگ پرویز کے معاون ومددگار کی حیثیت سے جنگ قادسیہ میں شریک تھے - قادسیہ کی شکست کے بعد ان لوگوں نے محسوس کیا کہ ایرانیوں کا

ساتھ دینے میں نہ تو ان کی بہبودی ہے اور نہ ان کی عزت ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل جانے میں فایدہ دیکھا چنانچہ یہ لوگ مسلمانوں سے مل گئے۔ مدائن میں مسلمانوں کے ساتھ ملکر لڑے، جنگ جلولاء میں بھی یہ مسلمانوں کے شریک تھے۔ بعد میں یہ لوگ کوفہ میں مسلمانوں کے ساتھ آباد ہوگئے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں کے اسلام قبول کرنے کے مختلف اسباب تھے۔ زیادہ تر لوگ اسلام کے قابل عمل عقاید اور مسلمانوں کی خلوص نیت سے متاثر ہوکر مسلمان ہوئے۔ لیکن بعض لوگ جزیہ سے بچنے یا دُنیاوی عزت حاصل کرنے کے لئے بھی مسلمان ہوگئے چنانچہ ایک مرتبہ حجاج ابن یوسف حاکم عراق کو یہ معلوم ہوا کہ لوگ محض جزیہ سے بچنے کے لئے مسلمان ہوگئے ہیں تو اس نے باوجود ان کے اسلام قبول کرنے کے ان سے جزیہ وصول کیا۔ چنانچہ علمائے بصرہ کو حجاج کی یہ زیادتی نہایت ناگوار گزری اور اس پر انھوں نے کافی شور مچایا۔

ممالک مفتوحہ کے باشندوں سے اختلاط کا اثر

ممالک مفتوحہ کے شہروں میں فاتح و مفتوح اقتصادی و اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کے شریک تھے۔ کوفہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں آدھے سے زیادہ آبادی موالی کی تھی، صنعت۔ حرفت۔ تجارت سب ان کے ہاتھوں میں تھی، یہ موالی عموماً زبان اور نسب کے لحاظ سے ایرانی تھے جو لڑائیوں میں گرفتار ہوئے تھے اور جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ یہ موالی اپنے مالکوں کے کاروبار میں عموماً شریک تھے۔

شام و مصر وغیرہ میں بھی مخلوط آبادی تھی۔ یہاں تک کہ جزیرۃ العرب بھی مخلوط عنصر سے نہ بچ سکا۔ مدینہ چونکہ دارالخلافہ تھا اس لئے یہاں سب لوگوں کی ضروریات کی وجہ سے آمد و رفت رہتی تھی۔ اس کے علاوہ حضرت عمرؓ نے حکم صادر فرمایا کہ مال غنیمت اور قیدی وغیرہ مفتوحہ ممالک میں لڑائی کے مقام پر تقسیم نہ کئے جائیں بلکہ سب دارالخلافت میں لائے جائیں اور یہاں ان کی تقسیم کی جائے۔

چنانچہ مدینہ اور اس کے مضافات میں بھی غیر عربی عنصر شامل ہوگیا۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک خیال ہے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت میں فارسی عنصر کی سازش شامل تھی۔ ان لوگوں نے ابولولو کو آلۂ کار بنایا۔ عربی و غیر عربی عنصر کے مدینہ سے اختلاط کی سب سے زیادہ وجہ یہ بھی تھی کہ مختلف بلاد اسلامیہ سے زائرین مدینہ آتے تھے۔ چونکہ زیارت کی غرض سے قلیل عرصہ کے لئے آتے تھے اس لئے ان شہروں میں غیر عربی عنصر کی دوسرے شہروں کی طرح زیادہ آبادی نہ تھی — بہرحال مذکورہ بالا اسباب کے تحت ایرانی و رومی طرز معاشرت اور خیالات پر ہوا۔ چنانچہ فارسی رومی و یونانی فلسفہ نے بھی عربی حکم اور ان کے خیالات میں اثر کیا۔ اور عربوں کے سیاسی۔ اجتماعی ذہنی اور دیگر شعبہ زندگی میں ان اختلاط کے تاثرات نمایاں ہونے لگے — چونکہ مفتوحہ اقوام کی تمدنی، سیاسی اور اجتماعی زندگی زیادہ منظم تھی اس لئے ان کے دست بالا رہنے کا زیادہ امکان تھا لیکن چونکہ عرب فاتح تھے اس لئے انھوں نے جو چاہا ردوبدل کرکے اختیار کرلیا۔ بلاد مفتوحہ کے بہت سے سابق ادارے بدستور قایم رہے۔ مثلاً نظام الدواوین اور مختلف محکمے وغیرہ۔ یہاں تک کہ ان دواوین میں دفاتر کی زبان بھی عبدالملک ابن مروان کے زمانہ تک قایم رہی — مفتوحہ اقوام، علم اور تدوین کے طریقوں سے بخوبی واقف تھیں، کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد جب ان کو سکون حاصل ہوا تو انھوں نے یا ان کی اولاد نے تحصیل علم کی طرف توجہ کی اور تدوین وغیرہ میں اپنا پرانا طریقہ اختیار کیا — اسلامی عقاید میں بھی غیر اقوام سے اختلاط کی وجہ سے کبھی کبھی مختلف اثرات کا اظہار ہوا۔ شامیوں، قبطیوں اور رومیوں نے جب اسلام قبول کیا تو ان میں بہت سے اپنے آباو اجداد کے پرانے عقاید یکدم فراموش نہ کرسکے۔ ان کا جہنم۔ ملائک۔ آخرت اور نبوت کا تصور مختلف تھا۔ چنانچہ اس کا اثر یہ ہوا کہ پہلی ہی صدی میں مختلف فرقوں کا ظہور ہونے لگا۔ پہلی صدی میں انھوں نے سیاسی عصبیت بھی قایم کرنے کی کوشش کی چنانچہ حضرت عمرؓ اپنی دوربینی کی وجہ سے موالی سے خطرہ محسوس کرتے تھے۔ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا "اللھم اعوذبک من اولاد سبایا الجلولیات" یعنی اے اللہ میں تجھ سے جلولا کے قیدیوں کی اولاد سے پناہ مانگتا ہوں — چنانچہ جنگ صفین میں موالی کی اولاد کا بہت تھا — بہرحال موالی نے ایک زمانہ میں عربوں کی سیاسی و اجتماعی زندگی کو بہت متاثر کر رکھا تھا۔ گو زبان میں بھی موالی بہت غلطی کرتے تھے۔

رعایتِ لفظی

ہمارے ہاں گفتگو کی نوک جھونک ضلع جگت اور پھبتی میں ہوتی ہے اور عام طور پر انہی صنعتوں کے ذریعہ بات چیت میں مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔

ضلع، رعایت لفظی کا نام ہے اور اس میں تلازمے کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس صنعت میں اس قسم کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں کہ جن کو دوسرے الفاظ کے ساتھ محض لفظی تعلق یا مناسبت ہوتی ہے۔ مثلاً حجام کا ذکر کیا جائے تو اُس سے متعلقہ چیزوں کے نام یا تو لفظ سے ظاہر ہوں یا تلفظ کرتے وقت صرف بولنے میں آجائیں، مگر ان کے معنی دوسرے ہوں۔ جس طرح کوئی حجام کی مناسبت سے کہے کہ:۔ آپ اپنے ہوش کے ناخن لیجئے۔

اگر میری بات میں سرمو فرق ہو تو میرا ہاتھ قلم کر دیجئے۔

سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔

یہ تو آپ کا اقبال (اق - بال) ہے۔

فارسی بولے آئی نا (آئینہ) — وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ اس صنعت کو عام طور سے لوگ بے محل استعمال کرنے لگے یہاں تک کہ بازار میں چل نکلی اور تھوڑے ہی دن میں یہ جنس اس قدر ارزاں ہوگئی کہ ہر بازاری اس کے سودے میں گرفتار نظر آیا اس لئے بعض شعرا نے ضلع اور بعض نے اس کو اس قدر وسعت دی کہ کشور شعر و سخن کا رکن اعظم بنالیا۔

ایک مرتبہ کوئی صاحب غالب سے ملنے آئے کلام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کا یہ شعر مجھے دور دراز سے کھینچ کر یہاں لایا ہے۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی — مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

(واضح رہے کہ یہ شعر غالب کا نہیں) غالب نے کہا کہ جس بزرگ کا یہ مطلع ہے اُس پر بقول اُس کے رحمت خدا کی اور اگر میرا ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔ مگر اس رحمت اور لعنت کے درمیان ایک طبقہ اور بھی ہے جن کی قلمرو کا ہر ضلع لفظی رعایتوں اور تلازمے کے پھولوں سے سرسبز اور شاداب نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک صاحب نے مرثیہ کہا جس کا مصرع ہے:۔

شامی کباب ہو کے پسندِ اجل ہوئے

یہاں شامی کباب کے ساتھ پسندے کا مزا کس کو نہیں آئے گا۔

یا کسی کا یہ شعر:۔

داڑھی مونچھوں کا سب صفایا ہے — فارغ البال ان کو کہتے ہیں

یہاں داڑھی مونچھوں کا صفایا اور فارغ البال کا لفظ سن کر کون نہ سر ہلائے گا۔

غرضیکہ ہزاروں غزلیں اور قصیدے اس صنعت سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر ضلع بازوں نے اس صنعت میں وہ وہ دریا بہائے ہیں کہ ان سب کی کوششیں نقش برآب کر دیں۔

امیر خسرو علیہ الرحمۃ کو صنایع و بدایع سے بے حد دلچسپی تھی۔ اور اس قسم کی صنعتوں سے صفحوں کے صفحے رنگ دئے ہیں۔ چنانچہ فارسی میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

او پان بخلق می سپرد و ہمہ خلق در پیش دکانش جاں سپاری می کرد

یہاں جاں سپاری کردن معنی جان دینا ہے اور سپاری پان کے ضلع کا لفظ بھی ہے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

آرے ۔ برما ۔ ستم نہانی می کرد

یہاں آرا ۔ برما ۔ نہانی ضلع کے الفاظ بھی ہیں اس کے علاوہ اُردو میں اُنھوں نے بہت سی پہیلیاں ۔ دوسخنے اور نسبتیں لکھی ہیں ۔ اور آخر میں ضلع کا لفظ ڈال کر اُس پہیلی کو خود بھی بوجھ گئے ہیں ۔۔۔ مثلاً موری کی پہیلی :-

چار مہینے بہت چلے اور آٹھ مہینے تھوڑی امیر خسرو یوں کہیں کہ بوجھ پہیلی موری

ناخن کی پہیلی میں فرماتے ہیں :- بیسوں کا سر کاٹ لیا ۔ نا مارا ۔ ناخون کیا

پہیلیوں کے علاوہ دوسخنوں اور نسبتوں کی بھی یہی کیفیت ہے جنھیں دو مختلف چیزوں کا نام لے کر مشترک لفظ بنا دیتے ہیں ۔

جس طرح ہمارے ہاں اکثر لوگ بیت بازی اور دوسرے مشاغل میں اپنا وقت گزارتے ہیں بعض اصحاب ضلع بازی میں ہی اپنا وقت صرف کرتے ہیں ۔ جہاں دو چار لوگ ایک جگہ بیٹھے اور ضلع شروع ہو گیا ۔ مثلاً کسی صاحب نے حقہ سرکایا اور یار لوگوں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا ۔ اب حقہ کے لئے مندرجۂ ذیل ضلع کے الفاظ ہیں :-

اپنا کوئی ہمدم ہے نہ دمساز ۔۔۔ ایں گل دیگر شگفت ۔۔۔ بندہ ہر دم تازہ رہتا ہے ۔۔۔ دل کی کلی کھلی رہتی ہے ۔۔۔ ہمارا خدا ضامن ہے ۔۔۔ چلمن سے لگے بیٹھے رہو ۔۔۔ منہ نیچا کئے ہوئے باہر سٹک گئے ۔۔۔ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن ۔۔۔ گڑ گڑ ہے اور شکر شکر ۔۔۔ سانچ کو کیا آنچ ہے ۔۔۔ سخن تازہ ۔ سوختہ دل ۔ وغیرہ وغیرہ

بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم ہے کہ تفنن طبع کا ذریعہ بن سکیں ۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر برمحل اور برموقعہ کسی گفتگو کے سلسلہ میں ضلع کے الفاظ بیٹھ جائیں تو پھر اُٹھائے نہیں اُٹھتے اور سامعین پر ایک پرلطف اور انبساطی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ۔۔۔ مثلاً ایک صاحب نے اپنے بچے کی ختنہ کی اور احباب کو دعوت دی ۔ چونکہ اُن کا اپنا مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام کسی خواجہ سرا کے مکان میں کیا ۔ استاد ذوق بھی مدعو تھے ۔ کھانا کھا کر صحن میں آ بیٹھے ۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دست مبارک سے گلوری کھلانا واجب ہے ۔ ذوق نے کہا کہ ضیافت تو سنت ہی تھی ۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پائیے ختنہ کی ضیافت اور خواجہ سرا کے مکان میں ۔ لکھنؤ کے ایک معرکے کے مشاعرہ میں شاہ نصیر نے ایک غزل نہایت مشکل طرح میں کہکر پڑھی جس کا مطلع تھا

خال لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی ، روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ کیا مکھی بیٹھی ہے ۔ کسی نے کہا کہ حضور اب کی مرتبہ ٹھیک نہیں بیٹھی ۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا ۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنھیں چاشنی سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف اُٹھاتے ہیں ۔ ہاں جنھیں صفرۂ حسد کا زور ہے اُن کا جی ہی متلائے گا ۔

ایک صاحب جوتا خریدنے گئے ۔ دوکاندار سے فرمایا کہ ایک خوبصورت جوڑے کی ضرورت ہے ۔ دوکاندار نے جواب دیا کہ حضور تو نرھی (نری) کا چاہتے ہوں گے ۔

ایک مرتبہ محفل میں غالب ، میر تقی میر کی تعریف کر رہے تھے ۔ ذوق نے سودا کو میر پر ترجیح دی ۔ غالب نے کہا میں تو آپ کو میری سمجھتا تھا مگر آج معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں ۔

ایک مرتبہ جارج سوم نے مشہور ظریف مسٹر مارک ٹون سے پوچھا کہ تاش کھیلنا جانتے ہو ۔ مارک ٹون نے جواب دیا کہ میں کیا جانوں میں تو بادشاہ اور غلیظے میں بھی فرق نہیں کر سکتا ہوں ۔

ایک ظریف ایک اعرابی کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ راستہ میں ظریف نے اعرابی سے پوچھا کہ تیرا کیا نام ہے۔ اُس نے جواب دیا مطر (باراں) پوچھا تیرے باپ کا کیا نام ہے۔ اُس نے جواب دیا ابواللغیث (پدر باراں) پھر پوچھا کہ تیری ماں کا کیا نام ہے اُس نے جواب دیا سحاب (ابر) پوچھا کنیت کیا ہے۔ اس پر اعرابی نے جواب دیا ام البحر (مادر دریا) ظریف نے کہا کہ ایک لحظہ ٹھیر کہ میں ناؤ لے آؤں۔ نہیں تو تو مجھ کو بھی لے ڈوبے گا۔

ایک سفید پوش اپنی شیروانی ہاتھ میں لئے واشنگ کمپنی پہونچے۔ منیجر نے کہا کیا حکم ہے۔ فرمایا مجھے استری کی ضرورت ہے۔ منیجر نے جواب دیا کہ اس وقت تو ہمارے ہاں کنڈمی ہو رہی ہے۔

بعض لوگ ضلع جگت کو بازاری اور گرا ہوا مذاق سمجھتے ہیں۔ مگر زبان کی حد تک تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ زباندانی کی کسوٹی ہے۔ اگر اس قسم کے الفاظ برمحل، واقعہ متعلقہ سے لپٹے ہوئے اور برجستہ کہدئے جائیں تو بولنے والے کی حاضر جوابی ذکاوت، علمی ذوق اور زباندانی کی بے ساختہ داد نکل جاتی ہے۔

بعض اوقات ضلع باز ضلع کا لفظ کھینچ تان کر لاتے ہیں اور اس طریقۂ عمل سے اُس بے چارے لفظ کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں مگر اہلِ مذاق کے نزدیک وہ بھی جائز ہے۔ اور بعض اوقات وہ لطف دے جاتا ہے بلکہ نہایت ہی لطیف مذاق کی شکل پیدا کر دیتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے ایک طوائف سے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ جواب دیا کہ مصری، اُس نے کہا کہ تمہارا نام بالکل ہی غلط رکھا گیا ہے تم تو شیرہ ہو شیرہ، طوائف نے جواب دیا کہ اگر آپ اسی میں خوش ہیں تو ہم شیرہ ہی سہی۔

ایک صاحب دوکان پر کچھ خریدنے گئے دوکاندار نے اُس کی قیمت بہت زیادہ کہی۔ خریدار نے کہا کہ آپ تو مونڈتے ہیں (حجام بنایا) دوکاندار نے جواب دیا کہ حضور ہم اس طرح مونڈتے ہیں اور آپ اُس طرح سے (استرے سے)

کسی کنجوس نے ایک ظریف سے پوچھا کہ میں اپنے بچے کو کون سا علم پڑھاؤں۔ ظریف نے جواب دیا کہ صرف نہ ہو (صرف نحو)

ایک شیخ اور پٹھان میں اپنی اپنی قومیت کے متعلق بحث ہو رہی تھی۔ شیخ نے کہا کہ پہلی کمزوری تو یہ ہے کہ آج تک پٹھانوں میں کوئی پیغمبر نہیں گزرا۔ پٹھان نے بگڑ کر جواب دیا کہ "او چغد عیسیٰ خاں جو گزرا ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ تمہارا باپ ہے"۔

غرض اس قسم کے بیسیوں لطیفے ہیں جن میں بڑی حد تک جواب کے ساتھ ساتھ ظرافت کی جھلک اور علمی لطافت علٰحدہ چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر اس قسم کا مزاح جب ہی لطف دیتا ہے کہ متکلمین اور سامعین دونوں کے دونوں الفاظ کے جوڑ توڑ اور تراش خراش سے بخوبی واقف ہوں۔ (قومی زبان)

مرزا بشارت اللہ بیگ

"نگار" کی آئندہ اشاعت ماہ جولائی اور سالنامہ ۵۵ء

(علماء اسلام نمبر)

نگار کی آئندہ اشاعت (ماہ جولائی) میں آئندہ سالنامہ کی ترتیب پر ایک مفصل مضمون شایع ہوگا جس سے آپ کو معلوم ہو سکے گا کہ یہ سالنامہ کتنی اہم تاریخی حیثیت رکھتا ہے اور اُردو میں اپنی جامعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی تصنیف ہے جس میں تمام اکابر علماء اسلام و ماہرین علوم و فنون کے حالات اور علمی اکتسابات کے ساتھ ساتھ ان کی تصانیف کی فہرست بھی پیش کیجائے گی۔

اپنا سلسلۂ خریداری جاری رکھئے تاکہ آپ یہ سالنامہ بغیر کسی مزید صرف کے حاصل کر سکیں

منیجر نگار

فارسی کی تاریخی و تمدنی اہمیت

ہر زبان اپنی الگ خصوصیات رکھتی ہے اور یہی خصوصیات عموماً ایک زبان کو دوسری زبانوں سے الگ کرتی ہیں، فارسی زبان بھی چند منفرد خصوصیات کی بنا پر دوسری زبانوں سے الگ ہے اور اس میں چند ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کی وجہ سے اس کو بہت سی دوسری زبانوں پر تفوق بھی حاصل ہے۔ مثلاً اس کے سیکھنے میں اس قدر آسانی ہے کہ کوئی دوسری ایشیائی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ——— سب سے بڑا سبب اُس کے قواعد کی آسانی ہے۔ اس میں تذکیر و تانیث کے جھگڑے بالکل نہیں۔ نہ ضمائر میں اس کا اثر ہے اور نہ افعال میں۔ "او گفت - من می گویم" مرد، عورت دونوں اپنے لئے یکساں استعمال کریں گے۔ علامتِ اضافت کسرہ ہے اور وہ بھی تذکیر و تانیث کی زد سے باہر ہے۔ علاوہ بریں گرامر کے اصول عموماً ہاطابطہ ہیں مستثنیات کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ غیر ملکی کو بھی اس زبان کے سیکھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی اور حقیقت حال یہ ہے کہ اپنی مادری زبان کے سہل یا دشوار ہونے کا اندازہ آسانی سے نہیں ہوتا۔ صحیح معیار تو غیر ملکی آدمی قائم کر سکتا ہے۔ فارسی کی گنتی بھی مقابلتہً بہت آسان ہے۔ اس سلسلہ میں کل اُنتیس نئے لفظوں سے فارسی کی تمام گنتیاں سکھائی جاتی ہیں، ایک، دو، تین، بیس لفظ، تیس سے ایک ہزار تک نو لفظ، برخلاف ہندوستانی کے کہ اس میں ہر عدد کے لئے نیا لفظ ہے، اس لئے صرف گنتی کے لئے ہزاروں نئے لفظوں سے سابقہ پڑتا ہے، عربی کی گنتی اس سے بھی زیادہ مشکل ہے، اس میں ہر عدد کی تقریباً چھ شکلیں ہوتی ہیں۔

فارسی زبان کی دوسری امتیازی خصوصیت اس زبان کی شیرینی و لطافت ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں ثقیل آوازیں از قسم ٹھ - ڑھ - ڈھ - ٹ - ڑ وغیرہ بالکل نہیں۔ علاوہ بریں اعراب کے قواعد کی وجہ سے بھی لفظ آسانی اور روانی کے ساتھ ادا ہو کر فقروں اور جملوں میں ایک قسم کا ترنم پیدا کر دیتے ہیں، جن سے بعض اوقات مفہوم نہ سمجھنے والا آدمی بھی لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔

فارسی کی تیسری مابہ الامتیاز خوبی یہ ہے کہ یہ ایرانی و عربی[1] کلچر کی آمیزش کا بہترین نمونہ ہے۔ جو فارسی ہم پڑھتے ہیں یہ وہ زبان ہے جو ایران پر عرب تسلط کے بعد معرضِ وجود میں آئی۔ اس زبان کا ڈھانچہ قدیم ایرانی یا پہلوی ہے اور رگ و پوست عربی۔ ضمائر، افعال روابط تو قدیم ایرانی ہیں اور اسما بیشتر عربی۔ یہ زبان اُس وقت پیدا ہوئی جب خلافت عباسیہ اپنے زریں عہد سے گزر کر انحطاط کی طرف

---

[1] ایران ہزارہا سال سے ایک مخصوص تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ وہاں کے طبعی و جغرافی حالات ایرانی زندگی میں سرایت کئے ہوئے تھے۔ چنانچہ عربوں نے جب ایران پر تسلط پایا تو گویا ایرانی تفلسف، لطافت طبع اور ذہانت اور عربی قوت عمل کا امتزاج ہوا۔ اس امتزاج نے ایسے شاندار نتائج پیدا کئے کہ شاید اس سے بہتر نتائج اور کہیں نہ پیدا ہوئے ہوں۔ بقول علامہ ابن خلدون عربی کی بیشتر تصانیف ایرانیوں کے قلم سے نکلیں اور علوم و فنون میں نہ صرف عربی ممالک ایران سے متاثر ہوئے بلکہ خود ترکی اور ہندوستان کے ادب پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ گویا ایرانی ذہن و فکر کے کارناموں کو اسلام (عربی قوتِ عمل) کے طفیل اتنا وسیع میدان عمل میسر آیا جتنا خود ساسانیوں کے زمانہ میں بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین بابت اگست ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۰)

طرف مایل ہو چکی تھی - چنانچہ ابتدا میں اس میں قدرتاً بیشتر عربی کے اسما شامل ہوئے کیونکہ اسماء کا تعلق براہ راست تہذیبی ترقی سے ہوتا ہے اور ایران میں عباسیہ حکومت تہذیبی و تمدنی ترقی کی وجہ سے اسلامی تاریخ میں خاص امتیاز رکھتی ہے - لیکن رفتہ رفتہ عربی اثر کمتر ہوتا گیا یہاں تک ایسے الفاظ جو براہ راست قدیم ایران سے متعلق تھے فارسی میں رائج ہو گئے اور وہی الفاظ مذہبی اصطلاحوں نے قبول کر لئے - چنانچہ صلوٰۃ کی جگہ نماز، صوم کے لئے روزہ - اللہ کے لئے خدا کا استعمال اس درجہ عام ہو گیا کہ لوگ اصل سے بے تعلق ہو گئے گویا فارسی میں یہ خالص مذہبی اصطلاحیں غریب و نامانوس ہو گئیں - "بیت اللہ" کا اطلاق صرف خانۂ کعبہ پر ہونے لگا اور اُس کے بجائے "خانۂ خدا" نہ صرف حرم پاک کے لئے عموماً مستعمل ہو گیا بلکہ تمام مسجدیں (جو اسلامی شریعت کے اعتبار سے "بیت اللہ" تھیں) "خانۂ خدا" ہو گئیں -

ان کے علاوہ عربوں اور ایرانیوں کے ملنے سے نئے علوم پیدا ہوئے - اور ان نئے علوم اسلامی کا ایران میں خاص طور پر رواج ہو گیا چنانچہ اس سرزمین نے کثرت سے ایسے علماء پیش کئے جنھوں نے اسلامی علوم کی جس حد تک خدمت کی ہے اس کی مثال عرب دُنیا پیش نہیں کر سکتی - فارسی ادب کی وسعت بھی عرب و ایرانی امتزاج کی مرہون منت ہے فارسی میں نئے نئے اسلامی علوم شامل ہوئے اسلامی تصوف نے ایران ہی کی زمین میں صحیح طور پر نشو و نما پایا چنانچہ اس موضوع پر جس قدر عمدہ ادب فارسی میں موجود ہے اُس سے عربی کا دامن خالی ہے، اخلاقی مضامین اسلامی نقطۂ نظر سے جس کامیابی کے ساتھ ایرانی شعراء نے پیش کیا ہے، عربی ادب اُسکے سامنے بے حقیقت نظر آتا ہے - فارسی شاعری بھی اسی مخلوط قسم کے تصور کی آئینہ دار ہے جس میں بلاشبہ ایرانی خصوصیات جزو غالب کا درجہ رکھتی ہیں - لیکن اسلامی و عربی اثرات نے اس تصویر کے خط و خال کو نیا رنگ اور نیا روپ بخشا ہے -

اس تفصیل کی اجمال یہ ہے کہ فارسی زبان ایک مشترک کلچر کی حامل ہے جس میں عربی و ایرانی تہذیب کے تمام جوہر جمع ہو گئے ہیں اس اعتبار سے بھی اس کو دنیا کی بیشتر زبانوں میں امتیازی درجہ حاصل ہے -

زبان کی غیر معمولی آسانی سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے کہ فارسی زبان بڑے بڑے خیال کے ادا کرنے سے قاصر ہو گی اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کو فارسی شعراء نے کامیابی کے ساتھ نمایاں نہ کیا ہو - کیا رزم کیا بزم — فردوسی کا شاہنامہ نہ صرف رزمیہ نظموں میں ممتاز ترین درجہ رکھتا ہے بلکہ دنیائے شاعری کا شاہ کار ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے - غزل کے میدان میں سوائے فارسی نے ایسے ایسے کارنامے چھوڑے ہیں جن کی مثال کمتر ادب پیش کر سکتے ہیں - سعدی و حافظ کی غزلوں نے دنیائے ادب میں جو دھوم مچا رکھی ہے اُس کے بیان کی ضرورت نہیں - عمر خیام کی رُباعیاں گو تعداد میں کم ہیں، لیکن انھیں یورپ میں جو مقبولیت حاصل ہو چکی ہے وہ محتاج بیان نہیں - اور غالباً یہ خیال غلط نہ ہو گا کہ شاید ہی کوئی دوسرا شاعر اتنے کم کلام کی بدولت اتنا مشہور و مقبول ہوا ہو - سعدی نے اخلاق جیسے خشک مضمون میں وہ لطافت پیدا کر دی ہے کہ گلستاں و بوستاں دُنیا کی بیشتر زبانوں میں منتقل ہو گئیں اور ان کتابوں کے سیکڑوں فقرے ہماری زبان میں ضرب المثل و محاورہ بن کر شامل ہو گئے - سنائی کی حدیقہ اور عطار کی منطق الطیر اور دوسری عارفانہ تصانیف نے ان کو زندہ جاوید بنا دیا - مولانا روم کی مثنوی معنوی فارسی قرآن متصور ہونے لگی - مختصر یہ کہ فارسی زبان ادبی سرمایہ سے مالا مال ہے -

ہندوستان میں جب مسلمان آئے تو اپنے ساتھ فارسی زبان بھی لائے - اگرچہ یہاں بھی زبان کا مسئلہ کافی پیچیدہ تھا - دیسی زبانوں کے علاوہ فارسی کی سب سے بڑی حلیف عربی تھی جو ایک قدیم زبان ہونے کی وجہ سے بہت وقیع تھی - علاوہ بریں اسلامی علوم کی زبان یہی سمجھی جاتی - مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ فارسی کے مقابلہ میں وہ کم مقبول ہوئی اور سرکاری زبان کے لئے صرف فارسی ہی منتخب ہوئی اور جب تک ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت رہی فارسی کے سامنے کسی دوسری زبان کا چراغ نہ جل سکا - عربی کے مقابلے میں فارسی کے مقبول ہونے کے چند در چند وجود ہیں جن میں بعض یہ ہیں :-

(۱) جن اسباب کی بنا پر ایران میں فارسی نے عربی کو پس پشت ڈال دیا تھا یہاں وہی بدرجۂ اتم موجود تھے۔ ایران میں عربی زبان اور عربی تمدن کا تسلط کئی سو سال رہ چکا تھا۔ فارسی زبان اُس وقت معرض وجود میں بھی نہ آئی تھی۔ لیکن وجود میں آتے ہی اس میں ایسی غیر معمولی جاذبیت پیدا ہوگئی کہ نہ صرف روزمرہ گفتگو کی زبان ہوگئی بلکہ علمی دنیا میں بھی اُس نے کافی مقبولیت حاصل کرلی۔ رفتہ رفتہ عربی کا اثر بالکل کم ہوگیا۔ ہندوستان میں عربی کا کچھ سابقہ عمل دخل نہ تھا اس لئے اس سے سبقت لے جانے میں فارسی کو کوئی زیادہ دشواری نہ حائل ہوئی ہوگی۔

(۲) فارسی آریائی نسل کی زبان ہے اس لئے ہندوستانی مزاج کے لئے سازگار اور یہاں کی زبانوں سے کافی مشابہ تھی۔ بخلاف عربی کے جو سامی نسل ہونے کی بنا پر یہاں کے مزاج کو سازگار نہیں ہوسکتی تھی۔

(۳) ہندوستان کے مسلمان حکمراں نسلاً افغانی۔ ترک۔ منگول اور سکونتاً ایرانی اور افغانی تھے اور درۂ خیبر سے ہندوستان میں داخل ہوئے اس لئے قدرتی طور پر ان کو فارسی سے زیادہ لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے فارسی ہی کو دربار کی زبان یا سرکاری زبان قرار دیا

(۴) ہندوستان کے قریب کے ملکوں کی زبان فارسی ہی تھی عربی نہ تھی۔ افغانستان۔ ایران اور ترکستان کے زیادہ حصوں میں فارسی رائج تھی۔ چنانچہ سیاسی اغراض کے تحت یہاں کی زبان فارسی ہی ہونا چاہئے۔ غلام۔ خلجی۔ تغلق۔ لودی خاندان ایران کے سلجوق اور تیموریہ خاندان کے معاصر تھے۔ اس عہد میں ایران نے نہایت نامور شاعر و ادیب پیدا کئے جنھوں نے فارسی کے ادبی سرمایہ کو نہایت مالامال کردیا۔ چنانچہ اس عہد سے ہندوستان میں شعرا و فضلائے ایران کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا جو نہ صرف علمی و تہذیبی زندگی میں اثر انداز ہوئے بلکہ اکثر سیاسی اقتدار بھی انھیں کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔ اور دہلی کی مرکزی حکومت ہی پر اُن کا اثر نہ تھا بلکہ اطراف و جوانب کے چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے یہاں ایرانی فضلا کی موجودگی باعث صد افتخار سمجھی جاتی تھی۔ سلطان التمش کے عہد کے سب سے مشہور مصنف محمد عوفی ہیں جن کا تذکرۂ لباب الالباب فارسی شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ ہے، صاحب موصوف بخارا سے متعلق تھے جو کبھی کبھی ایران کی حکومت کا جزو ہوجاتا تھا۔ بلبن کے بڑے لڑکے محمد سلطان نے سعدی شیرازی کو دو بار مدعو کیا[1] مگر وہ ضعف پیری کی وجہ سے نہ آسکے لیکن اُن کے سفر گجرات و قیام سومنات کی حیثیت "تاریخی معلوم ہوتی ہے، محمود شاہ بہمنی نے حافظ شیرازی کے بلانے میں جس طرح انتظامات کئے اس کا حال سب کو معلوم ہے، اور دور دراز بنگال کے سلطان غیاث الدین کے لئے حافظ نے جو غزل لکھ بھیجی وہ ہنوز اُن کے دیوان کی زینت ہے اور اُس سیاسی و ادبی تعلقات پر روشنی ڈالتی ہے جو ایران اور ہندوستان کے درمیان عرصہ سے استوار چلا آتا تھا۔ دکن کی بہمنی سلطنت کی سب سے مشہور ادبی و سیاسی شخصیت کا مالک محمود گاواں، ایران کے شہر گیلان کا رہنے والا تھا۔ مختصر یہ کہ مغلوں سے بہت قبل ہندوستان اور ایران کا علمی و تمدنی رشتہ نہایت مضبوطی سے قایم ہوچکا تھا۔ چنانچہ اس علمی و تمدنی میل جول نے ہندوستان والوں کے دلوں میں فارسی زبان و ادب کا وقار کافی بٹھا دیا تھا اور یہاں کے رہنے والے کافی تعداد میں شعر و ادب میں نام بھی پیدا کرچکے تھے۔ اُن متعدد شعرا میں جو خالص ہندوستانی زاہیں اور جنھوں نے فارسی شاعری میں کافی نام پیدا کیا ہے۔ مسعود، سعد، سلمان، امیر خسرو اور شیخ جمالی خاص طور پر ممتاز ہیں۔ اول الذکر کا بیشتر حصہ افغانستان وغیرہ میں گزرا تھا لیکن آخر دونوں بالکل ہندوستانی تھی۔ ان کی شاعری کا نشو و نما ہندوستان میں ہوا اور دونوں نے اپنے کمال کا لوہا اہل ایران سے منوایا تھا۔

---

[1] طبقات اکبری وغیرہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دعوت نامے ملتان سے بھیجے گئے تھے۔ شیخ سعدی نے دونوں بار اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان بھیجا اور امیر خسرو کے لئے سفارش کی (ملاحظہ ہو ترجمۂ انگریزی ص ۱۰۴)

مغلوں کی آمد سے ہندوستان اور ایران کے اس تمدنی و سیاسی رشتہ میں کافی مضبوطی پیدا ہوگئی۔ بابر جو ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی ہے اُس کی زندگی کا بیشتر حصہ ترکستان۔ ایران اور افغانستان میں بسر ہوا چنانچہ وہ ترکی اور فارسی پر یکساں قدرت رکھتا تھا اس طرح مغل حکومت کی بنیاد ان دونوں ملکوں کے سیاسی و تمدنی تعلقات پر قایم ہوئی اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ہمایوں نے اپنے دور ابتلا میں ایران ہی کو اپنا مرکز نگاہ بنایا۔ ہمایوں کی بازیابی حکومت چونکہ ایرانیوں کی مدد سے ہوئی تھی اس لئے اُس کے زمانہ میں ایرانی اثرات کافی زیادہ ہوگئے۔ اکبر کے عہد میں یہ اثرات پہلے سے زیادہ نظر آتے ہیں چنانچہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی نورجہاں کی شخصیت ہے جس نے ہندوستان میں ایرانی اثر کے پھیلانے میں براہ راست بڑی سعی کی۔ جہانگیر کا دربار بھی باپ کی طرح فضلائے ایران سے پُر تھا۔ شاہجہاں کے بھی عہد میں شعرا و فضلا کی بڑی تعداد ایران سے ہندوستان کھنچ آئی تھی۔ نہ صرف دہلی پر ایرانی نفوذ و اثرات اس درجہ زیادہ ہوتے چلے جارہے تھے بلکہ اس کے زیر اثر سارے صوبوں پر یہ نفوذ مرکز کی طرح تھے۔ علاوہ بریں آزاد ریاستیں بالخصوص بیجاپور کی عادل شاہی اور گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنتوں میں یہ اثرات دہلی کی مرکزی حکومت سے کچھ زیادہ ہی نظر آرہے تھے۔

۵۔ فارسی زبان کی غیر معمولی آسانی میں اُس کی مقبولیت کا راز مضمر ہے، جیسا عرض کیا جاچکا ہے کہ بہت کم توجہ سے اور کمتر مدت میں یہ زبان حاصل کی جاسکتی ہے۔

۶۔ فارسی ادب کی چند امتیازی خصوصیات نے اس زبان کو عام پسند بنانے میں کافی اہم حصہ لیا ہے اس کے ادب کا رجحان روحانی ہونے کی بنا پر ہندوستانی مزاج کو بے حد راس آتا ہے اس کا ادب مخلوط قسم کے تصوف کا آئینہ دار ہے اس لئے اس میں زیادہ لوچ اور جاذبیت ہے، اس ادب کے مطمح نظر میں کافی وسعت ہے، ایرانی شاعروں نے مسلم پر کافر کو، کعبہ پر بت خانہ کو، زاہد پر رند کو، شیخ پر برہمن کو جس طرح ترجیح دی شاید ہی کسی دوسرے ادب میں یہ چیز موجود ہو۔ تصوف کی آبیاری ایران ہی میں ہوئی۔ شعرائے ایران نے اس کی ترویج میں جتنا حصہ لیا اس سے کسی کو انکار ممکن ہے مثنوی مولانا روم نے ہندوستانی دماغ کو جس طرح قدرتاً متاثر کیا ہے وہ ہر شخص پر بخوبی ظاہر ہے، فارسی کی غزلوں میں جو لطافت ہے اُس سے زیادہ اُس کے عارفانہ و متصوفانہ عناصر ہندوستانیوں کے لئے زیادہ جاذب نظر ثابت ہوئے حافظ اور شمس تبریز کا کلام اس قیاس کا موید ہے۔ اخلاق پر فارسی شعرا نے جتنی طبع آزمائی کی ہے اتنی کسی دوسری زبان میں نہیں ہوئی۔

غرض یہ چند وجوہ تھے جن کی بنا پر فارسی زبان ہندوستان میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوگئی۔ ممکن ہے کہ اسباب کے متعین کرنے میں مجھ سے غلطی ہوگئی ہو یا لوگوں کو مجھ سے اختلاف رائے ہو۔ مگر یہ حقیقت نفس الامری ہے کہ ہندوستان میں ایک مدت مدید تک تہذیبی و تمدنی و سرکاری و دفتری زبان کے منصب جلیلہ پر فارسی ہی مامور رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے علوم اس زبان میں منتقل ہوگئے چنانچہ اس کا ادب کمیت اور کیفیت ہر لحاظ سے دوسرے تمام ادب سے ممتاز ہوگیا اور ظاہر ہے کہ اس سات آٹھ سو سال میں ہندوستان میں جو فارسی ادب پیدا ہوا اور جو قابل ذکر مصنف و شاعر وجود میں آئے اُن کا جایزہ لینے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔ یہاں صرف اس قدر عرض کیا جاتا ہے کہ علوم کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس کی زیادہ تر کتابیں فارسی میں نہ ہوں تاریخ۔ جغرافیہ۔ منطق۔ فلسفہ، ریاضی۔ سیاسیات۔ ادبیات۔ معاشیات وغیرہ سارے علوم پر کتابیں تصنیف ہوئیں گویا، ۸۔ سو سال پہلے کی تمدنی و سیاسی تاریخ کی حامل یہی زبان ہے، اس لئے نئے ہندوستان کی تعمیر میں اس زبان کا حصہ سب سے زیادہ ہونا چاہئے مگر افسوس کا مقام ہے کہ روز بروز اس کی طرف بے توجہی برتی جارہی ہے بلکہ صورت حال کچھ اس طرح پیدا ہورہی ہے جس میں فارسی کی طرف کم سے کم لوگ متوجہ ہوسکیں۔ ویسے پورے ملک میں فارسی کا الگ کوئی اسکول نہیں، عربی

مدارس تو کافی مل جائیں گے جہاں کچھ عرصہ پہلے تک فارسی کی چند کتابیں پڑھا دی جاتی تھیں مگر ان مدارس میں اتنا بھی نہیں ہوتا ایسے حالات میں وہ دور نہیں کہ فارسی ہمارے ملک میں بالکل ختم ہوجائے اور صدیوں کا ہمارا قیمتی سرمایہ نذر آتش ہوجائے مگر فارسی سے بے تعلق ہوجانے کے بعد جو نظام مرتب ہوگا خواہ سیاسی تمدنی یا علمی وہ بالکل لچر اور بودا ہوگا اور اُس کے تار و پود جلد بکھر جائیں گے ممکن ہے ہماری عمر میں یہ چیز نہ ہو لیکن آنے والی نسلیں اس کے تار و پود کو بکھرتے دیکھیں گی اور جو مورخ اس نظام کی بربادی کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا وہ ضرور اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ اس نظام کے مرتبین نے اپنی تنگ نظری و کوتاہ بینی کی بنا پر ماضی کے کارنامے کو پسِ پشت ڈال دیا تھا جس سے اس کی بنیاد کمزور اور کھوکھلی رہ گئی

آج کل تاریخی تحقیق پر بڑا زور دیا جا رہا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ تاریخی ریسرچ میں فارسی مخطوطات کو کس درجہ اہمیت حاصل ہے مگر ہمارے عہد کے مورخ فارسی سے بے تعلق ہوتے چلے جاتے ہیں اور اب ان کی تحقیق کا دارومدار ترجموں پر ہے جن میں بیشتر ترجمے نہیں بلکہ تلخیص ہیں اور اگر بالفرض وہ ہو بہو ترجمہ بھی ہوتے پھر بھی ان پر کسی مستند مورخ کو اعتماد نہ چاہئے - اس کی وجہ ہے کہ عموماً فارسی کتابوں کے مترجم فارسی کے عالم نہیں ہوتے اس لئے بسا اوقات اُن سے ایسی غلطیاں بھی سرزد ہوجایا کرتی ہیں جو بڑے غلط نتیجہ پر ڈال دی ہیں - خزائن الفتوح کا ترجمہ حال ہی میں تاریخ کے ایک مستند پروفیسر نے انگریزی میں کیا لیکن فارسی کے ایک عالم نے اُس میں اتنی غلطیاں بتائی ہیں کہ وہ اصل ترجمے کے برابر ہوجائیں گی - ایسے حالات میں ترجموں پر بھروسہ کرنا کس قدر خطرناک ہوگا - ترجموں کا ذکر ہی کیا ہے بسا اوقات ایک لفظ کے غلط پڑھنے سے ایسی صریحی غلطی ہوجاتی ہے کہ پھر صحیح نتیجہ پر آنا ناممکن ہوجاتا ہے - ایک مثال سے اس بیان کی وضاحت ہوجائے گی -

فتوحات عادل شاہی کے دسویں باب میں ذیل کی تین ذیلی سرخیاں ہیں :-

(۱) گفتار اندر اظہار ہنرمندانے کہ ہر یک وحید زمان خود بود در عہد ایں بادشاہ عادل ..... از جملہ خوش نویساں کہ در خدمت ایں بادشاہ می بود خلیل اللہ بیت شکن است -

(۲) گفتار اندر بیان حالات شعرائے فرخ بیان و مداحان بلند قدر ایں دودمان - اور اس کے ذیل میں ملک - ظہوری ذہنی اور باقر کے حالات درج ہیں :-

(۳) ذکر شعرائے سخندان و مداحان ایں آستان ..... خصوصاً نادر طبعان نادر کلامے کہ در جنب مداحان ایں دودمان والا رتبہ اند بہ زبان خجستہ بیان ذکر محامد خسرو آفاق و شہریار بہ استحقاق نمایند سرحلقۂ بادہ نوشان حکیم آتشی - اس کے ذیل میں آتشی اور مقیم کا حال درج ہے -

چونکہ یہ باب ابراہیم عادل شاہ ثانی کے سیاسی حالات کے بعد آیا ہے اس لئے بادی النظر میں اس کے ذیل کے سارے مشاہیر کا تعلق اسی عہد سے ہونا چاہئے چنانچہ ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم کی فہرست میں، پروفیسر باسو نے مہشار یکل جنرل میں، ہاشمی نے یورپ میں دکھنی مخطوطات میں اور ڈاکٹر زور نے اُردو شہ پارے میں اسی نقطۂ خیال کی وضاحت کی ہے اور آخر الذکر نے آتشی اور مقیم کو اُردو کا شاعر قرار دے کر اُردو کی تاریخ تقریباً ۴ سال پہلے بتادی ہے مگر چند قرائن کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیسری ذیلی سرخی کا تعلق ابراہیم عادل سے نہیں بلکہ اُس کے لڑکے محمد عادل شاہ سے ہے جس کے دربار سے مولف فتوحات عادل شاہی بھی متعلق تھا - منجملہ اور اسباب، اس عنوان کے افعال درخور اعتنا ہیں جو "زمانۂ حال" میں بیان ہوئے ہیں - خسرو آفاق و شہریار بہ استحقاق سے مراد محمد عادل اور ایں دودمان و ایں بادشاہ سے مراد ابراہیم عادل ہے -

آپ نے ملاحظہ کیا کہ چند لفظ کے غور سے نہ پڑھنے کی بنا پر کیسے کیسے فاضل صریحی غلطی میں پڑگئے - اگر کوئی صاحب اس کتاب کے ترجمے پر بھروسہ کریں یا تلخیص پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھیں تو وہ اصل سے کتنی دور جا پڑیں گے -

اسی طرح متعدد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ترجمے کا ذکر ہی کیا کبھی صرف ایک مخطوطے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اُس کتاب کے جتنے نسخے دستیاب ہوتے ہیں ان سب کے مطالعہ کے بعد کوئی صریحی بات کہی جا سکتی ہے۔

مگر میرا خیال ہے کہ اس طرح کے حالات زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکیں گے اور یہ افراتفری جلد ختم ہو کے رہے گی۔ اب اس کا احساس ہو چلا ہے کہ فارسی سے مغائرت کا نتیجہ حد درجہ خطرناک ہے چنانچہ ہسٹری کانگریس کے سولھویں اجلاس میں جو دسمبر ۱۹۵۳ء میں بمقام وال ٹائر ہوا تھا اُس میں ایک شعبے کے صدر نے بڑی شد و مد کے ساتھ اس عدم توجہی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی تھی۔

اس سلسلے میں میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں:۔

اول یہ کہ فارسی کے شائقین کو چاہئے کہ وہ ایسے مخطوطات کو منصۂ ظہور پر لائیں جن سے اب تک لوگ روشناس نہیں ہیں۔ تاریخ کے عالم ممکن ہے کہ ترجمے یا تلخیص کے ذریعہ کچھ کام چلا لے جائیں لیکن نئے مواد کی تلاش اور نئے مخطوطات کی دریافت اُن کے بس سے باہر ہے۔

دوسرے یہ کہ: اچھے اچھے مخطوطات کی مدد سے عمدہ ٹکسٹ طیار کریں۔

تیسرے یہ کہ: جن کتابوں کے ترجمے نہیں ہوئے اُن کے ترجمے کریں۔

چوتھے یہ کہ: جن کتابوں کے ترجمے ناقص ہوں اُن کے نقص دور کریں۔

پانچویں یہ کہ: ان ترجموں سے جو غلط نتائج پیدا ہوئے ہیں ان کا پتہ لگائیں۔

چھٹے یہ کہ: ایسی کتابوں کا پتہ لگائیں جن کا ترجمہ ترجمہ نہیں بلکہ تلخیص ہے۔

ساتویں یہ کہ: خالص ادبی کتابوں سے زیادہ تاریخی کتابوں کی طرف زیادہ توجہ کریں

آٹھویں یہ کہ: اپنے تحقیقی تجربے کو انگریزی اخباروں اور رسالوں کے ذریعہ عام کریں۔

اگر فارسی علماء کی توجہ ان امور پر ہو جائے تو وہ دن دور نہیں جب ان کا اپنا کھویا ہوا وقار قایم ہو سکتا ہے۔

ہماری گفتگو ناقص و نامکمل رہے گی اگر ہم فارسی کے اُس نفوذ و اثر کو نظر انداز کر دیں جو اُس نے ہماری تمدنی زندگی پر ڈالا ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ہمارے تمدن کی تعمیر فارسی کی بنیاد پر ہوئی تو بے جا نہ ہوگا۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ کوئی آدمی اُس وقت تک متمدن و مہذب نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک فارسی میں اُسے دستگاہ حاصل نہ ہو۔ روزمرہ کی گفتگو میں فارسی کے اشعار۔ ضرب الامثال، محاورات بڑی کثرت سے استعمال ہوتے تھے اور اردو زبان کا ذکر ہی کیا ہے۔ آج بھی اگر علماء کی صحبت میں جانے کا اتفاق ہو تو ہمیں اپنی تہذیب کے کچھ خدوخال نظر آجائیں گے۔ سعدی و حافظ کے ہزاروں شعر بطور ضرب الامثال کے ہماری گفتگو کے جزو لاینفک تھے۔ ہمارے بیشتر محاورے اور ضرب الامثال فارسی کے ترجمے ہیں۔ حال ہی میں مشہور ڈرامہ نویس پرتھوی راج نے لکھنؤ یونیورسٹی کی ایک صحبت میں جو گفتگو کی ہے اُس سے فارسی زبان کے اُس گہرے اثر و نفوذ کا پتہ چلتا ہے جو ہماری تمدنی زندگی پر پڑا ہے، انھوں نے اپنے ایک جملے میں کہا تھا۔ یہاں وہی مثال صادق آتی ہے کہ "گلے خوشبوئے درحمام روزے" ظاہر ہے اُن کا اشارہ سعدی کے اُس مشہور قطعے کی طرف تھا جسکی پہلی بیت یہ ہے:۔

گلے خوشبوئے درحمام روزے فتاد از دست محبوبے بدستم

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا تعزیتی جلسہ ندوہ میں تھا اُس میں "قرآن" جیسے ٹھوس مضمون کی ابتدا فارسی کی ایک رندانہ بیت سے ہوئی، درمیان میں اسی قبیل کے متعدد شعر آئے اور خاتمہ بھی ایک رندانہ ہی بیت پر ہوئی۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو نبتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

معاشرۂ انسانی پر بھی فارسی نے کچھ کم اثر نہیں ڈالا۔ لباس میں سیکڑوں نام ایران سے آئے مثلاً فرغل۔ لبادہ، کرتا۔ قبا۔ آستین۔ گریبان۔ پاجامہ۔ ازار۔ رومال۔ شال۔ دوشالہ۔ تکیہ وغیرہ۔ اسی طرح کھانے کے سلسلہ کے بکثرت نام ایران سے ماخوذ ہیں مثلاً دسترخوان۔ چپاتی۔ شیرمال۔ باقرخانی۔ پلاؤ۔ زردہ۔ مزعفر۔ قلیہ۔ قورمہ۔ متجن۔ فالودہ۔ اچار۔ رکابی۔ تشتری۔ کفگیر۔ چمچہ۔ کشتی۔ چائے۔ سینی وغیرہ وغیرہ۔

ہندوستانی زبانوں پر فارسی نے جو اثر کیا ہے اُس کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ سیکڑوں الفاظ۔ فقرات۔ محاورات فارسی ہی کے ہیں۔ صرف و نحو کے اصول میں بہت سی زبانوں نے فارسی سے اخذ کئے ہیں۔ فارسی ترکیب اضافی و ترکیب توصیفی نے یہاں کی زبانوں کی اصل صورت ہی بدل دی ہے۔ اُردو یا ہندوستانی، گجراتی۔ دکنی۔ مرہٹی وغیرہ زبانیں خصوصیت سے فارسی سے متاثر ہوئی ہیں، چنانچہ چند علماء نے اپنی کتابوں میں اس موضوع پر کسی قدر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ فارسی نے صرف مرہٹی کو کس قدر متاثر کیا ہے، آخرالذکر کے محاورے تشبیہیں۔ طرز تخیل وغیرہ فارسی سے مستفاد و متاثر ہیں۔ اسی طرح بھاشا وغیرہ پر فارسی نے جو اثرات ڈالے ہیں اُن کو مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اجمالی طور پر بیان کیا ہے۔ اگر کسی صاحب کو شوق ہو تو وہ بہ آسانی فارسی کے اثرات گجراتی، دکنی اور بنگالی وغیرہ زبانوں پر پا سکتے ہیں۔

بہرحال اس امر سے انکار ناممکن ہے کہ فارسی نے ہندوستان کی تہذیب۔ تمدن۔ زبان طرز معاشرت پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ اُن کی تفصیل جب سامنے آئے گی تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ فارسی سے بے تعلق ہو جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے اب، اپنے تمدن اور اپنی معاشرت سے بیگانے ہو جائیں گے۔ مختصر یہ کہ فارسی سے وابستگی میں اپنے تمدن سے وابستگی کا راز مضمر ہے اور ہمارے نزدیک فارسی سے بے گانہ ہونے میں ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہوگا کہ جو ہماری زندگی کا شاہکار ہے اُسی سے ہم بے گانہ و بے تعلق ہو جائیں۔

(ڈاکٹر) نذیر احمد (لکھنؤ یونیورسٹی)

بیاض نیاز

طالب آملی :- زغارت چمنت ہر بہار منتہاست
که گل بدستِ تو از شاخ تازه تر ماند

میرزا صائب :- عالم بے خبری طرفہ بہشتے بود ست
حیف صد حیف که ما دیر خبردار شدیم

دانش مشہدی :- تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرۂ چوں مے تواند شد چرا گوہر شود

جہانگیر :- لب گزیدی و من از ذوق فتادم مدہوش
با تو کیفیتِ ایں بادہ ندانم که چه کرد

عرفی :- ہمیں بس ست دلیلِ بقا ز عالم عشق
که یک شبِ غم او در ہزار سال گزشت

آزادی کی قربان گاہ پر

میڈم رولینڈ اُن چند نفوس انسانی میں سے ہے جن کے کارنامے صفحات تاریخ پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو چکے ہیں اور زمانہ کے اختیار سے باہر ہے کہ انھیں محو کردے۔

انقلاب فرانس میں جن لوگوں نے کام کیا، ان کی تعداد کثیر ہے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی لیکن جنس نازک کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ اُن چند ہستیوں میں جنھوں نے فرانس کے تخت استبداد کو اُلٹ دینے میں اپنی قربانیاں پیش کیں، ان میں ایک خاتون (میڈم رولینڈ) بھی تھی جو آزادی کے لئے اپنی گردن کٹا کر آنے والی نسلوں کے لئے اپنی بیش بہا درسِ بصیرت چھوڑ گئی۔

ایک عورت اور وہ بھی حسین، بجائے خود ایک ایسی چیز ہے جو بلا کسی نمایاں سبب کے انقلاب بپا کرسکتی ہے، چہ جائیکہ ایک مصلح کی حیثیت سے اس کا بے حجاب ہوجانا کہ اس وقت اس کا جمال ایک مقدس آگ بن جاتا ہے اور دُنیا مشکل سے یہ آگ کبھی بجھائی جاسکتی ہے۔

یہ ۱۷۵۴ء میں بمقام پیرس پیدا ہوئی اور میری جین اس کا نام رکھا گیا۔ اس کا باپ اک معمولی حیثیت کا انسان تھا اور نقاشی و بت سازی اس کا آبائی پیشہ تھا۔

چونکہ میری جین فطرۃً بہت طباع و ذہین تھی اس لئے نہایت کمسنی سے ادبی ذوق اس کا نمایاں ہونے لگا اور نو سال کی عمر میں پلوٹارک اور روسو کی تحریروں کو صد درجہ دلچسپی سے پڑھنے لگی۔

اس نے خود لکھا ہے کہ "پلوٹارک کی تحریریں حقیقتاً میرے لئے غذائے روح تھیں اور میں اُس زمانہ کو کبھی نہیں بھول سکتی جب نو سال کی عمر میں گرجا کے اندر بجائے انجیل کے میں لنٹ لیجایا کرتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب میرے اندر جمہوریت کے جذبات پیدا ہونے شروع ہوئے"۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ پلوٹارک کی تحریریں اس کے اندر جذبات حریت پیدا کر رہی تھیں، لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ان جذبات میں زندگی پیدا کی روسو کے مقالات نے جو اس وقت فرانس کے لٹریچر میں ایک جدید مذاقِ انقلاب پیدا کر رہا تھا۔

اسے روسو کا اندازِ تحریر اس قدر پسند تھا کہ جب حالت قید میں اس نے اپنے حالات لکھے ہیں تو روسو کی طرح بلا کم و کاست اپنے تمام حالات نہایت آسانی سے ظاہر کردئے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ اپنی شکل و صورت کے بیان میں لکھتی ہے کہ:-

"چودہ سال کی عمر میں میرا قد ۵ فٹ کا تھا، میرے پاؤں اور پنجے بہت سڈول تھے، سینہ چوڑا اور چھاتیاں بھری ہوئی تھیں، میری رفتار میں ایک خاص شان تھی، اور میرے قدم چلنے میں سبک پڑتے تھے اور جلدی جلدی۔ میرے چہرہ میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی سوا اس کے کہ رنگ میں بہت تازگی و شگفتگی تھی۔ دہانہ بڑا تھا لیکن لبوں کا تبسم حد درجہ دلکش و شیریں تھا، آنکھیں زیادہ بڑی نہ تھیں، لیکن ان میں وحشت و شوخی بدرجۂ غایت پائی جاتی تھی، ابرو کی نقاشی بہت نازک و پرخم تھی جس میں جذبات کے لحاظ سے مختلف انداز کے بل پڑجاتے تھے، پیشانی کشادہ و حسین تھی، جلد نرم و نازک تھی، بازو گول تھے، انگلیاں نرم اور نازک، دانت سفید تھے اور نہایت خوبصورت۔ الغرض میں

اپنی تمام خلقت کے لحاظ سے صرف اس لئے وضع ہوئی تھی کہ دُنیا میں عیش و مسرت کی زندگی بسر کروں۔"

اسی طرح اس نے اپنے شوہر، موسیو رولینڈ کے حالات بھی لکھے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی صورت و شکل کے لحاظ سے قابل امتیاز نہ تھا، لیکن اس کی جو ادا اس کے نزدیک مقبول تھی وہ اس کی گفتگو کا فلسفیانہ انداز تھا جو اپنے اندر ایک عالمانہ شان رکھتا تھا۔ میڈیم رولینڈ لکھتی ہے کہ:۔

"شادی ہونے کے بعد میں نے تمام حالات کا اندازہ کرکے یہ فیصلہ کرلیا کہ صرف اپنے شوہر کے ساتھ تنہائی میں زندگی بسر کردینا میری حیات کو تلخ بنادے گا اس لئے کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ دنیا کے ہنگامہ میں مل گئی۔"

چونکہ رولینڈ، گرونڈسٹ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس درمیان میں بیسٹیل کے سقوط سے انقلاب کی لہر زیادہ سرعت کے ساتھ دوڑ گئی تھی اس لئے میڈم رولینڈ اس جماعت میں شامل ہوگئی۔ جہاں اس کی دلکش شخصیت، اس کی ادبی قابلیت اور اس کی غیر معمولی ذہانت نے بہت جلد نمایاں امتیاز حاصل کرلیا اور اس کا مکان انقلاب پسند جماعت کی جولانگاہ بن گیا۔

اس جماعت کے تمام سربرآوردہ لوگ ہفتہ میں چار بار اس کے مکان پر جمع ہوتے، تمام مسایل حاضرہ پر گفتگو کرتے اور اس حسین خاتون کے مشورہ کے مطابق اپنی سیاسی تدابیر استوار کیا کرتے جن میں سے بعض حد درجہ خطرناک ہوتی تھیں

جب ۱۷۹۲ء میں بادشاہ مجبور ہوا کہ گرونڈسٹ جماعت کے ہاتھ میں عنانِ وزارت سپرد کردے تو رولینڈ وزیر داخلہ مقرر ہوا اور ہر چند یہ خدمت نہایت اہم، مشکل اور پیچیدہ تھی، لیکن میڈم رولینڈ نے اپنے شوہر کی تمام خدمات کا بار اپنے سر لے لیا۔ یہاں تک کہ وزارت داخلہ کے تمام بہترین کارنامے جو رولینڈ سے منسوب ہوسکتے ہیں، دراصل اسی خاتون کے دماغ سمجھے جاتے ہیں۔

گرونڈسٹ جماعت، وہ جماعت تھی جو انقلاب فرانس کے دوران میں ڈیماکریسی کی طرفدار تھی اور اس کے زیادہ ذی اثر ممبر وہ تھے جو صوبہ گرونڈ کے نمایندے تھے (اسی لئے انھیں گرونڈسٹ کہتے ہیں) رفتہ رفتہ ان کا اثر فرانس میں اس قدر بڑھا کہ لوئی شانزدہم کو وزارت اسی جماعت کے سپرد کردینی پڑی۔ لیکن چونکہ ملک کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوچکا تھا اور انارکزم عام ہوتی جاتی تھی، اس لئے گرونڈسٹ طبقہ جو یک گونہ بادشاہ کے وجود کو غیر ضروری نہ سمجھتا تھا، غیر مقبول ہونے لگا اور گو بعد کو انھوں نے بادشاہ کی معزولی اور اس کے بجائے ایک جماعت انتظامی کے قیام کی تجویز کو پیش کیا لیکن وہ انقلابی روح جو پیدا ہوچکی تھی کسی طرح محو نہ ہوسکی اور آخرکار اس ساری جماعت کو انارکی کا شکار ہونا پڑا جس میں میڈم رولینڈ بھی شامل تھی۔

جب اس سلسلہ میں رولینڈ گرفتار ہونے کے بعد بھاگ گیا تو میڈم رولینڈ گرفتار کرکے قید خانہ پہونچائی گئی یہاں اُسے پانچ مہینے تک رہنا پڑا، اول اول یہ زنانہ قید خانہ کی ایک کوٹھری میں بند کی گئی لیکن اُس نے مطلق پروا نہیں کی اور اپنے ایام اسیری حد درجہ صبر و ضبط کے ساتھ بسر کرنے لگی۔ یہاں یہ کتابیں دیکھتی تھی اپنے حالات لکھتی تھی اور نہایت اطمینان سے اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کی منتظر تھی، چونکہ اس سے قبل اس کے تمام ساتھیوں کو سزائے موت دی جاچکی تھی اس لئے اُسے اپنے متعلق بھی معلوم تھا جو کچھ ہونے والا تھا مگر اسے کوئی خوف و ہراس نہ تھا اور وہ زنداں میں اس طرح زندگی بسر کررہی تھی، جیسے کسی ڈرائنگ روم میں۔

جس دن اس کے ساتھیوں کو سزائے موت دی گئی، اس کے دوسرے دن (یکم نومبر ۱۷۹۳ء) وہ بھی اس مجلس میں منتقل کردی گئی، جہاں اس کے ساتھی مقید تھے۔ یہاں یہ ۶ دن تک رہی اور اس درمیان میں دو مرتبہ وہ عدالت میں لائی گئی اور اس کے خلاف شہادت کی سماعت ہوئی جس دن آخری سماعت ہوئی اس کی شام کو ایک نوجوان وکیل جس نے اس کی

طرف سے نہایت دلیرانہ جوابدہی کی تھی اس کو تسلی دینے آیا اور کہا کہ کل پھر ملاقات ہوگی۔ میڈم رولینڈ نے نہایت خاموشی سے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اتار کر اُس کو دی اور کہا کہ آپ میری طرفداری کر کے اپنی جان کو خطرہ میں نہ ڈالیں اور نہ مجھ سے آپ ملنے کی کوشش کریں کیونکہ کل تو میں زندگی کے تمام رشتے قطع کر کے ابدیت سے وابستہ ہو جاؤں گی"۔

دوسری صبح جب وہ اُٹھی تو اس نے سفید ملبوس پہنا کمر میں سیاہ مخملی پٹی باندھی اور کمر تک اپنے بالوں کو کھولے ہوئے ایک نورانی فرشتے کی طرح سزائے موت کا حکم سننے کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی، لبوں پر تبسم تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی حیات کا بہترین فرض انجام دینے جا رہی ہے۔ جب موت کا حکم سننے کے بعد وہ مقتل میں پہونچائی گئی تو تمام لوگوں پر سکوت طاری تھا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر متاثر تھا، لیکن وہ بدستور مسرور تھی اور نہایت مطمئن قدموں کے ساتھ قتل گاہ پر جا رہی تھی۔

اس کے ساتھیوں میں سے ایک اور شخص کو سزائے موت دی گئی تھی جو اس کے ساتھ تھا لیکن وہ سخت متاثر تھا اپنے لئے نہیں بلکہ میڈم رولینڈ کے لئے اور وہ بے انتہا مضطرب تھا کہ میڈم رولینڈ کو ذبح ہوتے ہوئے وہ کیونکر دیکھ سکے گا۔ میڈم رولینڈ نے اس بات کا اندازہ کر کے جلاد سے کہا کہ پہلے اس آدمی پر اپنے حربہ کا استعمال کرے اور وہ غالباً انکار کر دیتا اگر وہ مسکرا کر نہ کہتی کہ " نہیں نہیں، مجھے یقین ہے کہ تم ایک خاتون کی آخری التجا کو ضرور پوری کرو گے"۔

میڈم رولینڈ نے نہایت عزم و ثبات کے ساتھ اس کا قتل ہونا دیکھا اور اس کے بعد وہ خود بڑھی، لیکن قبل اس کے کہ تلوار اس کے سر کو تن سے جدا کرتی، اس نے مجسمۂ آزادی سے جو سامنے نصب تھا خطاب کر کے کہا کہ:-

"اے آزادی کی دیوی، تجھے کچھ خبر ہے کہ تیرے اوپر اس سے قبل کتنی انسانی قربانیاں چڑھ چکی ہیں اور آیندہ کتنی قربانیاں چڑھیں گی"۔

وہ یہ جملہ ختم ہی کر چکی تھی کہ اس کا سر تن سے جدا تھا اور خون کا فوارہ چاروں طرف کی زمین کو رنگین بنائے ہوئے تھا۔

محمد عاقل

حساب کی بات

امریکہ میں کسی دلدلی مقام پر سڑک بنائی جا رہی تھی، انجینر نے اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ پندرہ آدمیوں کی مدد لگا کر اس کام کو جلد ختم کر دو۔ چنانچہ کام شروع کر دیا گیا، لیکن دو چار دن کے بعد ہی اس نے رپورٹ پیش کی کہ دلدل قد آدم سے زیادہ گہری ہے اس لئے سڑک بننا بہت مشکل ہے۔

انجینر نے برہم ہو کر کہا کہ " میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ اس کام کے لئے جو چیزیں درکار ہوں ان کی فہرست بنا کر باقاعدہ منظوری حاصل کرو"۔

اسسٹنٹ انجینر نے دوسرے دن جو فہرست پیش کی، اس میں صرف یہ لکھا تھا:-

" پندرہ آدمی اٹھارہ اٹھارہ فیٹ کے لمبے جو پندرہ فٹ گہری دلدل کو پار کر سکیں"۔

دعوتِ نقد و نظر

(بہ سلسلۂ ماسبق)

۲۹- حسن کی شانیں تھیں جتنی سب نمایاں ہوگئیں جو ترے رخ سے بچیں رنگِ گلستاں ہوگئیں

(یہ شعر غلط چھپ گیا ہے شانیں کی جگہ شانیں لکھا گیا۔ اس لئے اس شعر کے متعلق جو رائیں ظاہر کی گئی ہیں، وہ درست نہیں کی جا سکتیں)

۳۰- دھجیاں باقی ہیں جتنی اب مرے کس کام کی جو گریباں ہونے والی تھیں گریباں ہوگئیں

عطا :- گریبان کو دھجیاں بنایا جاتا ہے نہ کہ دھجیوں کو گریبان۔

درد :- دھجیاں کیونکر گریبان بن سکتی ہیں۔

قریشی :- شعر مہمل ہے

فرمان :- دھجیوں کا گریبان ہونا عجیب بات ہے۔

انجم فوقی :- دھجیاں کس طرح گریباں ہوگئیں؟ شاعر نے اس معمہ کو حل نہیں کیا۔

۳۱- دل کی تسکیں کے لئے دو پھول دامن میں نہیں اس طرح ہوں آج گلشن میں کہ گلشن میں نہیں

عطا :- پہلے مصرعہ میں پھول کے بعد بھی اور دوسرے مصرعہ میں "گلشن میں نہیں" سے پہلے گویا کا لفظ لانا مناسب ہے۔

قریشی :- دو پھول بھی ہونا چاہئے۔ گلشن کی تکرار بیکار ہے۔

فرمان :- گلشن میں رہکر "دامن میں پھولوں" کی تخصیص سے کوئی حسن پیدا نہیں ہوتا۔ آج کا لفظ بھرتی کا ہے۔ دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے :- "اس طرح گلشن میں ہوں جیسے کہ گلشن میں نہیں"۔

انجم فوقی :- مصرعۂ ثانی اگر یوں کہدیا جاتا تو شعر بے عیب ہوجاتا :- "اس طرح گلشن میں ہوں میں۔ جیسے گلشن میں نہیں"

۳۲- چین اسیرانِ قفس کو یاد گلشن میں نہیں دوڑتی ہیں بجلیاں سیلابِ خوں تن میں نہیں

عطا :- سیلاب نہیں، سیل یا سیلان چاہئے۔

درد :- سیلاب خون کی ترکیب نادرست ہے۔

قریشی :- سیلاب خون مناسب نہیں۔

فرمان :- چین کا خون تقطیع سے خارج ہے۔ بجلیوں کا دوڑنا بھی محلِ نظر ہے۔ سیلاب خون کی ترکیب بھی درست نہیں

انجم فوقی :- "سیلابِ خون" سے مراد غالباً دورانِ خون ہے اور "بجلیاں دوڑنے" کا مطلب اضطراب سمجھ لیا گیا ہے اس معنوی تضاد نے مصرعہ کو مہمل بنا دیا ہے۔

۳۳- دید کے قابل ہے یہ رنگِ سبک روحی مرا ڈھونڈھتی ہے برق مجھ کو، میں نشیمن میں نہیں

عطا :- رنگِ سبک روحی اچھا ٹکڑا نہیں۔ شعر میں بیجا مبالغہ بھی ہے۔

درد :- دید کے قابل کی جگہ دیدنی ہونا چاہئے۔

فرمان :- سبک روحی میں غائب یا پوشیدہ ہو جانے کی کیفیت کیونکر پیدا ہو گئی - پھر اس کو دید کے قابل بھی کہا گیا

انجم فوقی :- "رنگ" کی جگہ کوئی اور لفظ ہونا چاہئے -

۳۴- کیوں خزاں میں سر جھکائے مضمحل بیٹھا ہوں میری نظروں میں تو ہیں جو پھول گلشن میں نہیں

عطا :- اس شعر میں بظاہر کوئی سقم نہیں -

درد :- جو کی جگہ گو ہونا چاہئے -

قریشی :- جو کی جگہ گو ہونا چاہئے

انجم فوقی :- مصرعۂ اولیٰ میں "عہدِ خزاں" تسلیم کر لیا گیا ہے اور مصرعۂ ثانی سے پتہ چلتا ہے کہ پھول ابھی گلشن میں ہے

۳۵- اشارہ ہے کسی کی اک نظر کا وگرنہ کیا ہے جانِ تواں میں

عطا :- اشارہ کے بہتر لفظ تصرف ہوتا -

درد :- وگرنہ یہاں وگرنا ہو گیا ہے -

قریشی :- جب زندگی کو کسی کی نظر کا اشارہ تسلیم کیا ہے تو پھر دوسرے مصرعہ میں ناتواں کا لفظ نہ لانا چاہئے تھا
ورنہ کی جگہ وگرنہ محض لفظ پورا کرنے کے لئے لایا گیا ہے -

فرمان :- کوئی خاص بات نہیں ہے

انجم فوقی :- "اشارہ" کی جگہ سہارا ہوتا تو شعر با معنی ہو جاتا -

۳۶- یہ رنگِ اتحاد ، اللہ اکبر شبیہِ دل ہے ہر اشکِ رواں میں

عطا :- ہر اشک یا ہر قطرۂ اشک ؟ دوسرے یہ کہ اشک میں شبیہِ دل کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا -
ہاں قطرۂ اشک ہی شبیہِ دل ہو جائے تو البتہ ممکن ہے -

درد :- دوسرے مصرعہ میں ہے ہر تنافر صوتی ہے - ہر اشک رواں کی ترکیب بھی غیر صحیح ہے -

قریشی :- رنگ کی جگہ کوئی اور لفظ ہونا چاہئے -

فرمان :- اگر دوسرا مصرعہ یوں ہوتا :- "کسی کا عکس ہے اشک رواں میں" تو حسن و عشق کا اتحاد بیشک ثابت ہو

انجم فوقی :- "اشک رواں" کی تخصیص کیوں ؟ - صرف "اشک" کہا جاتا تو مناسب تھا -

۳۷- جرس کے بھی جو اُٹھکر ہوش کھو دیں وہ نغمے ہیں مرے سازِ فغاں میں

عطا :- اُٹھکر بے محل استعمال ہوا ہے - سازِ فغاں کے لئے نغمہ بھی نا مناسب لفظ ہے -

درد :- جرس کے ہوش کھونے کی ترکیب عجیب ہے اور سازِ فغاں اس سے عجیب تر -

قریشی :- نغمہ کا اُٹھنا محاورہ نہیں - دوسرے سازِ فغاں میں نغمہ کیسا ؟

فرمان :- جرس کے ہوش کھونا اور پھر اُٹھکر !

انجم فوقی :- "نغمہ اُٹھنا" کوئی محاورہ نہیں - اس کے علاوہ شعر میں تعقید بھی ہے -

۳۸- ٹھیس لگ جائے نہ انکی حسرتِ دیدار کو اے ہجومِ غم سنبھلنے دے ذرا بیمار کو

عطا :- اُن کی حسرتِ دیدار سے مترشح ہوتا ہے کہ معشوق کو بھی عاشق کے دیکھنے کی حسرت ہے - یہ شانِ معشوق کے خلاف ہے -

درد :- معشوق کا عاشق کے دیدار کی حسرت رکھنا عجیب بات ہے -

ریشی :- حسرت کو ٹھیس لگ جانا کیا معنی۔
مان :- اُن کا اشارہ محبوب کی طرف ہے اس لئے شعر مہمل ہے۔ اگر اُس کہا جاتا اور اس سے اشارہ بیمار کی طرف ہوتا تو شعر با معنی ہو جاتا۔
م فوقی :- پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے۔

۳۹- وفورِ کیف سے دل اتنا بیقرار نہ ہو میں ڈر رہا ہوں کہ مضطر نگاہِ یار نہ ہو

طا :- عاشق کے وفورِ کیف سے نگاہِ یار کا مضطر ہونا کیا معنی ؟ مضطرب ہو سکتا ہے۔
رد :- اتنا کا الف دبتا ہے۔ اور دل سے پہلے اے ہونا چاہئے۔
ریشی :- اے دل ہونا چاہئے، مضطر کا استعمال بھی غلط ہے۔
مان :- وفورِ کیف سے دل کا بیقرار ہونا کیا معنی ؟
م فوقی :- "وفورِ کیف" سے دل بے قرار نہیں ہوتا۔ دوسرے مصرع میں "مضطر" کی جگہ مضطرب ہونا چاہئے۔

۴۰- بھرے ہوئے ہیں نگاہوں میں حسن کے جلوے یہ کیا مجال جہاں میں ہوں اور بہار نہ ہو

طا :- جہاں کے ساتھ اور بیکار ہے
رد :- جہاں کے بعد وہاں بھی ہونا چاہئے۔
ریشی :- نگاہوں میں حسن کے جلوے بھرے ہونے سے بہار پیدا نہیں ہو سکتی۔
مان :- دوسرے مصرع میں ہوں اور "اور" دونوں بیکار ہیں۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے:-
یہ کیا مجال، جہاں میں رہوں بہار نہ ہو
م فوقی :- مصرعِ ثانی کا انداز بیان ناقص ہے، یہ کچھ اس طرح ہونا چاہئے کہ ہم خزاں پر بھی نظر ڈال دیں تو بہار ہو جائے

۴۱- خیالِ وصل سے کرتو رہا ہوں کچھ باتیں قریب ہی کہیں لیکن نگاہِ یار نہ ہو

طا :- خیالِ وصل سے باتیں کرنا اور نگاہِ یار کا قریب ہونا دونوں مہمل ہیں۔
رد :- "قریب ہی کہیں" نے شعر کو بہت گرا دیا۔
مان :- نگاہِ یار قریب ہو یا دور، خیالِ وصل کو کیسے دیکھ سکتی ہے۔
م فوقی :- "نگاہِ یار" قریب ہو یا دور "خیالِ وصل" سے باتیں کرنے میں کیا حرج جبکہ نگاہ صرف دیکھ سکتی ہے سُن نہیں سکتی۔

۴۲- رخ پہ جھونکوں سے جو وہ زلف دوتا پھرتی ہے کیسی بل کھائی ہوئی بادِ صبا پھرتی ہے

طا :- زلف دوتا کا رخ پر جھونکوں سے پھرنا نتیجہ ہے بادِ صبا کی چھیڑ کا اس لئے بادِ صبا کا بل کھانا بے محل ہے، اگر اترائی ہوئی کہا جاتا تو مناسب تھا۔
رد :- جھونکوں کا استعمال بالکل غیر ضروری ہے
ریشی :- پہلے مصرعہ میں ردیف کا استعمال صحیح نہیں۔ دوسرے مصرعہ میں "بل کھائی ہوئی" کی جگہ "بل کھاتی ہوئی" ہونا چاہئے
مان :- زلفِ دوتا کا پھرنا، اس کا بکھرنا نہیں ہے۔
م فوقی :- "زلفِ دوتا پھرتی ہے" کوئی محاورہ نہیں۔

۴۳- اللہ رے تیغِ عشق کی برہم مزاجیاں میرے ہی خونِ شوق میں نہلا دیا مجھے

طا :- "مجھے میرے ہی" محلِ نظر ہے۔ خونِ شوق بھی نامناسب ہے جبکہ تیغِ عشق پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔

درد :- برہمی مزاج ہونا چاہئے۔
قریشی :- دوسرے مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی دوسرے کے خونِ شوق میں بھی نہلایا جا سکتا تھا۔
فرمان :- "برہم مزاجی" کو تیغ سے منسوب کرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور ہو بھی تو خون سے نہلا دینے کا کیا مطلب ہے۔ خون سے نہلانا یہاں حقیقی معنی میں تو استعمال کیا نہیں گیا اور چونکہ محاورہ بھی نہیں ہے اس لئے کوئی بامعنی بات نہیں نکلتی۔
انجم فوقی :- پورا شعر بے جا تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں۔

۴۴- خوش ہوں کہ حسن یار نے خود اپنے ہاتھ سے اک دل فریب داغ تمنا دیا مجھے،
عطا :- خود اپنے ہی ہاتھ کی تخصیص بیکار ہے۔ وہ کسی دوسرے ذریعہ سے کیوں فریب دے گا۔
درد خود اپنے ہی ہاتھ کا ٹکڑا فضول ہے۔
قریشی :- حسن یار نے اور خود اپنے ہاتھ سے معقول طرز بیان نہیں۔ دلفریب سے کوئی بات پیدا نہیں ہوتی۔
فرمان :- اپنے ہاتھ کی تخصیص بیکار ہے۔
انجم فوقی :- "داغ تمنا" کے لئے صرف "حسن دوست" کافی تھا "خود اپنے ہاتھ سے" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

۴۵- دُنیا سے کھو چکا تھا مرا جوشِ انتظار آوازِ پائے یار نے چونکا دیا مجھے،
عطا :- دُنیا سے یا دل سے ؟
درد :- پہلے مصرعہ میں مرا کی جگہ مجھے ہونا چاہئے۔
قریشی :- لفظ مرا غیر ضروری ہے۔
فرمان :- مرا کی جگہ مجھے ہونا چاہئے
انجم فوقی :- پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے، علاوہ ازیں "جوشِ انتظار" کہنے کی وجہ بھی شعر سے ظاہر نہیں۔

۴۶- کیا خبر تھی خلشِ ناز نہ جینے دے گی یہ تری پیار کی آواز نہ جینے دے گی
عطا :- پیار کی آواز کو خلشِ ناز کہنے کی توجیہ ؟
درد :- پیار کی آواز نادرست ہے۔ "پیار کی بات" ہوا کرتی ہے۔
قریشی :- خلشِ ناز کی ترکیب اچھی نہیں۔
فرمان :- خلشِ ناز نئی چیز ہے اور پھر عاشق میں اس کا پایا جانا حیرت کی بات ہے۔
انجم فوقی :- "خلشِ ناز" مبہم بات ہے۔

۴۷- قہر کی لاکھ نگاہوں کی ضرورت کیا ہے لطف کی اک نگہ ناز نہ جینے دے گی
عطا :- لاکھ کا لفظ بے محل ہے، نگاہ کے ساتھ ناز کا لفظ بھی زاید ہے جب کہ لطف کہہ چکے ہیں۔
درد :- لطف کے بعد نگہ ناز نادرست ہے۔
قریشی :- لاکھ کی تخصیص بڑی بھونڈی بات ہے۔
فرمان :- "قہر کی لاکھ" کی جگہ قہر آلود ہونا چاہئے۔
انجم فوقی :- پہلے مصرع میں لاکھ ذوقِ سلیم پر بار ہے۔

۴۸- مسلکِ عشق مرا مجھ کو نہ مرنے دے گا تیری شوخی ستمِ ناز نہ جینے دے گی

عطا :- شوخیِ ستم ناز کی ترکیب مبہم ہے۔ دونوں مصرعوں میں تطابق نہیں۔ وہ کونسا مسلک عشق ہے جن میں جان دینا گناہ ہے۔

درد :- ستم ناز نے دوسرے مصرعہ کو مہمل بنا دیا۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے :- "شوخیِ چشم فسوں ساز نہ جینے دے گی"

قریشی :- مسلک کا استعمال معقول نہیں۔

فرمان :- مسلک کے استعمال کا کوئی موقع نہ تھا۔ مسلک عشق اور ستم ناز میں باہم کوئی تعلق نہیں اس لئے تقابلِ حسن جو مقصود شاعر تھا پیدا نہ ہو سکا۔

انجم فوقی :- پہلے مصرع میں معنوی تعقید ہے۔ دوسرا مصرعہ بھی تشنۂ مفہوم ہے

۴۹- کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی

عطا :- کیا چیز تھی کی جگہ کیا قہر تھی زیادہ زوردار ہوتا۔ جگر اف کر کے بیٹھ گیا یا دردِ جگر؟ درد کا اُٹھنا تو خیر ایک بات ہے لیکن اس کا اُف کر کے بیٹھ جانا، کیا ہے؟

درد :- کیا چیز تھی کی تکرار بے محل ہے۔ دردِ جگر کا بیٹھنا بھی عجیب بات ہے۔ درد اُٹھتا ہے بیٹھتا نہیں۔

قریشی :- کیا چیز تھی کی تکرار بے معنی ہے۔

فرمان :- کیا چیز تھی کی تکرار نے بے لطفی پیدا کر دی۔ علاوہ اس کے دل بیٹھتا ہے، درد اُٹھتا ہے۔

انجم فوقی :- پہلے مصرعہ میں تکرار قبیح ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "بیٹھ گیا دردِ جگر بھی" عجیب بات ہے۔

۵۰- پھر گئی ان کی نظر پھر گئے دُنیا سے وہ دوستیِ جسم و جاں اب نہ سُنی جائے گی

عطا :- "پھر گئے دُنیا سے وہ" غیر مربوط ٹکڑا ہے۔

درد :- "دوستیِ جسم و جاں نہ سنی جائے گی" کیا۔ "دوستیِ جسم و جاں کی کہانی" ہونا چاہئے۔

قریشی :- "پھر گئے دنیا سے وہ" اس سے کیا مراد ہے

فرمان :- زبان و خیال دونوں حیثیتوں سے شعر مہمل ہے۔

انجم فوقی :- "پھر گئے دُنیا سے وہ" کیوں؟ شعر سے ظاہر نہیں ہوتا، دوسرا مصرعہ بھی زبان کے معیار پر پورا نہیں اُترتا

۵۱- خاک ہے جذب عشق کی "تاثیر" خامشی ہی جو گفتگو نہ کرے

عطا :- خامشی کا گفتگو کرنا جذب عشق پر منحصر نہیں ہے۔

درد :- خامشی بات چیت نہیں ہوتی۔ اس سے بات چیت کا کام البتہ کیا جا سکتا ہے۔

قریشی :- جذب کا لفظ غلط استعمال ہوا ہے۔

فرمان :- پہلے مصرعہ میں استفہام کا انداز ضروری تھا یعنی کیا خاک کہنا چاہئے تھا۔ دوسرے مصرعہ کا تعلق بھی "عشق کی "تاثیر" سے کچھ نہیں ہے۔

انجم فوقی :- مصرعے دو لخت ہیں اور دوسرا مصرعہ مہمل ہے۔

۵۲- عاشقی یاس کی محکوم ہوئی جاتی ہے بیکسی اب مرا مفہوم ہوئی جاتی ہے

عطا :- پہلا مصرعہ بالکل بے معنی ہے۔

درد :- عاشقی، مایوس نہیں ہوا کرتی، زندگی چاہئے۔

فرمان :- دوسرے مصرعہ کے قافیہ نے شعر کو مضحکہ خیز بنا دیا۔ اب کا لفظ بھی زائد ہے۔ یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا۔

"بیکسی زیست کا مفہوم ہوئی جاتی ہے"

ہم فوقی :- "عاشقی" کی جگہ زندگی - کر دیا جائے تو اچھا خاصا شعر ہو جائے گا -

۵۳ - دل ہوا خاک تپِ غم سے مگر دل کی جگہ اک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

عطا :- "معلوم ہوئی جاتی ہے" غیر مانوس ترکیب ہے -

درد :- " "

قریشی :- پہلے مصرعہ میں اب بھی کا مفہوم پیدا ہونا چاہئے -

رمان :- معلوم، محسوس کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نادرست ہے

ہم فوقی :- مصرعۂ ثانی اس طرح ہونا چاہئے تھا :- "اک خلش سی مجھے محسوس ہوئے جاتی ہے"۔
لیکن اس غزل کے اشعار کا قافیہ معلوم - معدوم وغیرہ ہے اور ردیف ہے "ہوئی جاتی ہے"۔ "معلوم ہوئی جاتی ہے" میں علم و آگہی اور دریافت کا مفہوم پایا جاتا ہے - جس کا شعر سے کوئی تعلق نہیں -

۵۴ - دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے،

عطا :- اس شعر میں بھی وہی عیب ہے علاوہ اس کے دل دھڑکنا کی جگہ دل کا دھڑکنا ہونا چاہئے -

درد :- دل کا دھڑکنا ہونا چاہئے - خبر تو کا ٹکڑا بھی درست نہیں

قریشی :- دوسرا مصرعہ مبہم ہے -

رمان :- دوسرے مصرعہ میں کہ کی جگہ کی کا وزن چاہئے - پھر یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ دل کی خبر معلوم ہو جاتی ہے یا محبوب کی - آخر الذکر کے لئے محض دل دھڑکنا کافی نہیں کسی اور دلیل کی ضرورت ہے -

ہم فوقی :- اس شعر میں بھی ردیف نبھ نہ سکی - اس کے علاوہ دوسرے مصرعہ میں "کہ" کی جگہ کچھ ہونا چاہئے تھا -

۵۵ - دل تھا ترے خیال میں پہلے چمن چمن اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

عطا :- دل کا روش روش ہونا، کیا چیز ہے ؟

درد :- دوسرا مصرعہ یوں ہونا چاہئے :- "افسردہ ہو کے اب یہ کلی پائمال ہے"

قریشی :- دل کا روش روش ہونا بے معنی بات ہے -

رمان :- "دل کا روش روش" ہونا قطعاً مہمل ہے

ہم فوقی :- دل کا "چمن چمن" ہونا تو خیر ٹھیک ہے لیکن اس کا "روش روش" ہونا کیا چیز ہے -

۵۶ - نگاہِ قہر کے صدقے، جھکی نہ غیر کی سمت مجھی یہ تیز ہوئی یہ مجھی پہ لال ہوئی

عطا :- محاورہ نگاہ لال ہوئی ہے - "جھکی نہ غیر کی سمت" بھی غیر مستحسن ہے - نظر جھکنا اور معنی رکھتا ہے - یہاں نگاہ پڑنے کا سوال ہے - یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا :- "نگاہِ قہر کے صدقے پڑی نہ غیروں پر"

قریشی :- اُٹھی نہ غیر کی سمت ہونا چاہئے - علاوہ ازیں نگاہِ قہر کا تیز ہونا یا لال ہونا محاورہ نہیں -

رمان :- نگاہِ قہر کا تیز ہونا تو سمجھ میں آتا ہے - لیکن نگاہ کا لال ہونا درست نہیں، محاورہ "آنکھوں کا لال ہونا" ہے -

ہم فوقی :- جھکی کی جگہ اُٹھی ہونا چاہئے -

(سید اختر علی تلہری)

مارچ ۱۹۵۴ء کے نگار میں "دعوتِ نقد و نظر" کے تحت جو شعر شایع کئے گئے ہیں وہ بھی اُسی شاعر کے ہیں جس کے شعر اکتوبر ۵۳ء کے نگار میں نقد کے لئے شایع کئے گئے تھے۔ میں نے ان اشعار کو غور سے پڑھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے کو شعر کسی عمیق جذبہ یا کسی حسین خیال کی تصویر کشی نہیں کرتا۔ عام روایتی باتیں سستے لہجہ میں پامال انداز سے کہدی گئی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میرے اس خیال کا واضح ثبوت ہیں :-

فرصت کہاں کہ چھیڑ کریں آسماں سے ہم — لپٹ پڑے ہیں لذتِ دردِ نہاں سے ہم
بے تابیوں نے کام دیا دستِ ناز کا — آخر لپٹ کے سو گئے دردِ نہاں سے ہم
کس کس پہ جان دیجئے کس کس کو چاہئے — گم ہو گئے ہیں بزمِ تمنا میں آ کے ہم
خوف صیاد سے عالم ہے یہ بیتابی کا — کہ ابھی ہوں تو ابھی صحنِ گلستاں میں نہیں
خیالِ وصل سے کر تو رہا ہوں کچھ باتیں — قریب ہی کہیں لیکن نگاہِ یار نہ ہو

اس عام نقص سے قطع نظر بیشتر اشعار میں زبان و بیان و خیال کی کوتاہیاں بھی ملتی ہیں، اُنھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا کہ یہ اشعار کسی ماہرِ فنِ غزل گو کا نتیجۂ فکر نہیں ہیں بلکہ کسی نو آموز کی شعری مشقیں ہیں۔

۱- چشمِ طلب میں اور کوئی آشیاں ہے اب — میرے لئے قفس مجھے سارا جہاں ہے اب

دوسرے مصرعہ میں "میرے لئے" کے ساتھ "مجھے" حشو ہے۔

۲- دل کو کیا تاب کہ پہونچے صفِ مژگاں کے قریب — جلوے خود لوٹ رہے ہیں صفِ مژگاں کے قریب

جلوؤں سے مراد حسن یار ہی کے جلوے ہو سکتے ہیں اور رخِ تاباں تک محدود کر دینا حسنِ یار کی توہین ہے۔

۷- ذرّے ذرّے سے نمایاں شانِ قدرت دیکھ کر — کھل گئیں آنکھیں طلسمِ حسنِ فطرت دیکھ کر

اس شعر کے مصرعے دو لخت ہیں۔

۸- یہ ہجومِ غم یہ اندوہِ مصیبت دیکھ کر، — اپنی حالت دیکھتا ہوں اُن کی حالت دیکھ کر

"اندوہِ مصیبت" بے معنی ہے "اندوہ" کے معنی خود رنج کے ہیں۔

۹- عمر بھر کا ساتھ رنج و غم میں دے سکتا ہے کون — شمع بھی رخصت ہوئی میری مصیبت دیکھ کر

"عمر بھر کا ساتھ" بالکل بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ "کا" کی جگہ "تک" ہونا چاہئے۔

۱۰- لالہ و گل کو دیکھتے کیا یہ بہار دیکھ کر — رہ گئے بیخودی میں ہم صورتِ یار دیکھ کر

"رہ گئے بیخودی میں ہم" یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ارادہ و اختیار کی حدوں سے اسے کوئی تعلق نہیں لیکن پہلے مصرعہ انداز بتاتا ہے کہ صورتِ یار دیکھ کر شاعر لالہ و گل کو قصداً دیکھنا نہیں چاہتا۔

۱۵- اللہ ری حسن و عشق کی سحر آفرینیاں — خوش ہو رہے ہیں گھر کا گھروندا بنا کے ہم

دوسرا مصرعہ بے جان اور بے کیف ہے اور اس کی زبان بھی معیاری نہیں ہے۔

۲۳- چھوڑا نہ تپِ عشق نے کچھ بھی کسی گھر میں — دل سے جو لگی آگ بجھی جا کے جگر میں

اگر جگر میں جا کر آگ بجھ گئی تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جگر بھی جل جائے کیونکہ وہاں جا کر آگ بہر حال بجھ گئی۔

۲۴- اب شمع بھی بجھتی ہے مرادم بھی لبوں پر — کیا دیر ہے یارب شبِ فرقت کی سحر میں

پہلے مصرعہ کے دوسرے ٹکڑے کے بعد ہے کا ہونا ضروری تھا۔

۲۵- کچھ یہ کہ عرضِ شوق کی طاقت نہیں مجھے اور کچھ یہ ہے کہ مصلحتِ یار بھی نہیں

دونوں مصرعوں سے توازن غائب ہے۔ پہلے مصرعہ میں ہے "کچھ یہ کہ" اور دوسرے مصرعہ میں ہے "اور کچھ یہ ہے"

۲۶- وہ دل کہ جس پہ صرف تمنا بھی بار تھا اب صرفِ شکوہ سنجیِ اغیار بھی نہیں

وہ دل جس پر صرف تمنا بھی بار ہو اگر "صرفِ شکوہ سنجیِ اغیار" نہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اگر اس کا عکس ہوتا تو استعجاب کا محل ہوتا۔

۲۸- ڈوب کر دل میں وہ نظریں تیر و پیکاں ہو گئیں رہ گئیں جو دل کے باہر نشترِ جاں ہو گئیں

جو نظریں دل کے باہر رہ گئیں وہ کیونکر نشترِ جاں ہو گئیں؟ شعر میں اس دعوے کا کوئی ثبوت نہیں۔

۳۱- دل کی تسکیں کے لئے دو پھول دامن میں نہیں اس طرح ہوں آج گلشن میں کہ گلشن میں نہیں

"دو پھول" کیوں۔ "اک پھول" کیوں نہیں؟

۳۲- چین اسیرانِ قفس کو یادِ گلشن میں نہیں دوڑتی ہیں بجلیاں سیلابِ خوں تن میں نہیں

"اسیرانِ قفس میں" "سیلابِ خوں" کیسا۔ "سیلابِ خوں" کی ترکیب مکروہ ہے۔

۳۳- دید کے قابل ہے یہ رنگِ سبک روحی مرا ڈھونڈھتی ہے برق مجھ کو میں نشیمن میں نہیں

"سبک پروازی" کی جگہ "سبک روحی" ذوقِ لطیف پر گراں ہے۔ اس کے ماسوا "برق" سے یہ فرار کیوں اور بازیگری کے اس شعبدے کی نمائش سے عشق کا کون سا مقام طے ہو گیا۔

۳۴- کیوں خزاں میں سر جھکائے مضمحل بیٹھا رہوں میری نظروں میں تو ہیں جو پھول گلشن میں نہیں

دوسرے مصرعہ میں "وہ" کا حذف درست نہیں، اسم موصول "جو" "وہ" کا سہارا ڈھونڈھ رہا ہے۔

۳۵- اشارہ ہے کسی کی اک نظر کا، ورنہ کیا ہے جانِ ناتواں میں

لفظ "اشارہ" کا استعمال یہاں غیر مناسب ہے۔ اشارہ کی جگہ اگر "کرشمہ" نظم کیا گیا ہوتا تو شاعر کا مفہوم زیادہ واضح اور حسین طریقہ سے ادا ہو جاتا۔

۳۷- جرس کے بھی جو اُٹھ کر ہوش کھو دیں وہ نغمے ہیں مرے سازِ فغاں میں

اول تو "نغموں" کے لئے "اُٹھنا" بالکل ہی غیر مناسب ہے۔ ثانیاً اگر سازِ فغاں سے ایسے نغمے بلند ہوئے جن سے گھنٹے کی ٹن ٹن دب گئی تو اس میں کیا شاعرانہ لطف پیدا ہوا؟

۳۹- وفورِ کیف سے دل اتنا بے قرار نہ ہو میں ڈر رہا ہوں کہ مضطر نگاہِ یار نہ ہو

"وفورِ کیف" میں دل کا بے قرار ہونا زبردستی کی بات ہے۔

۴۲- رخ پہ جھونکوں سے جو وہ زلف دوتا پھرتی ہے کیسی بل کھائی ہوئی بادِ صبا پھرتی ہے

ہوا کے جھونکوں سے "زلفِ دوتا" کا رخ پر پھرنا دیہاتی زبان ہے، صحیح زبان یہ ہے:۔ "رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں"

۴۶- کیا خبر تھی خلشِ ناز نہ جینے دے گی یہ تری پیار کی آواز نہ جینے دے گی

"پیار کی آواز" "خلشِ ناز" کیونکر بن گئی؟

۴۷- قہر کی لاکھ نگاہوں کی ضرورت کیا ہے لطف کی اک نگہِ ناز نہ جینے دے گی

"نگہِ ناز" کے بعد "ہی" کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

۴۸- مسلکِ عشق مرا مجھ کو نہ مرنے دے گا تیری شوخی ستمِ ناز نہ جینے دے گی

جب مسلکِ عشق مرنے نہ دے گا اور ستمِ ناز کی شوخی جینے نہ دے گی تو پھر حاصل کیا ہو گا؟

۴۹- کیا چیز تھی کیا چیز تھی ظالم کی نظر بھی اُف کر کے وہیں بیٹھ گیا دردِ جگر بھی،

شعر یکسر تصنع ہے اور "بیٹھ گیا" کے لفظ سے کھیلنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۵۳- دل ہوا خاک تپِ غم سے مگر دل کی جگہ اک خلش سی مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

۵۴- دل دھڑکنا بھی غنیمت ہے تری فرقت میں کہ خبر تو مجھے معلوم ہوئی جاتی ہے

دونوں شعروں میں ردیف غلط استعمال ہوئی ہے۔

۵۶- نگاہِ قہر کے صدقے جھکی نہ غیر کی سمت مجھی پہ تیز ہوئی یہ مجھی پہ لال ہوئی

"نگاہ کا لال" ہونا خلاف محاورہ ہے۔

دعوتِ نقد و نظر

(قسط سوم)

اس مرتبہ بغیر کسی کے انتخاب کے پوری دو غزلیں دی جا رہی ہیں اور آیندہ بھی یہی کیا جائے گا۔ تاکہ اگر کوئی شعر قابلِ تعریف ہو تو اس کی داد بھی دی جائے ..... اور شاعر کی غزل میں اچھے اور بُرے اشعار کا تناسب بھی معلوم ہو سکے۔ واضح رہے کہ جس مجموعہ سے یہ غزلیں نقل کی جا رہی ہیں، وہ بہ لحاظ مختلف تازہ ترین مجموعہ ہے۔

نظر ملتے ہی دل کو وقفِ تسلیم و رضا کر دے
جہاں سے ابتدا کی ہے وہیں پر انتہا کر دے

وفا پر دل کو صدقے، جان کو نذرِ جفا کر دے
محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فنا کر دے

چمن دُور، آشیاں برباد، پر ٹوٹے ہوئے بازو
مرا کیا حال ہو، صیاد اگر مجھ کو رہا کر دے

چُنے ہیں میں نے بھی کچھ پھول تیرے باغِ معنی سے
الٰہی تو اگر حُسنِ قبول ان کو عطا کر دے

تری مجنوں ادائی سے جگر یہ خوف آتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو اُن کو بھی عالم آشنا کر دے

دل کی خبر، نہ ہوش کسی کو جگر کا ہے
اللہ اب یہ حال تمہاری نظر کا ہے

اُس سمت دیکھتی بھی نہیں، رخ جدھر کا ہے
سب سے بڑا اُصول تمہاری نظر کا ہے

دل رکھ دیا ہے سامنے لا کر خلوص سے
آگے اب اس کے کام تمہاری نظر کا ہے

سب رفتہ رفتہ داغِ الم دے گئے مگر
محفوظ ہے وہ زخم، جو پہلی نظر کا ہے

میرے دلِ حزیں میں کہاں تابِ اضطراب
جو کچھ کمال ہے وہ تمہاری نظر کا ہے

کس طرح دیکھوں جلوۂ جاناں کو بے حجاب
پردہ پڑا ہوا مرے آگے نظر کا ہے

پیہم ہجومِ یاس سے آتا نہیں یقیں
تم میرے سامنے ہو کہ دھوکا نظر کا ہے

ایک سنگ پرست فلسفی

(یونان کا مشہور فیلسوف)

یہ فلسفی جس کا نام دیوجانس کلبی تھا، حضرت مسیح سے چار سو تیرہ سال قبل صوبہ نبطس (یونان) کے شہر سینوپ میں پیدا ہوا اس کا باپ اسکیوس صرافی کیا کرتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی کھوٹے روپے بھی چلاتا تھا۔ اس لئے گرفتار کر لیا گیا اور قید ہونے کے بعد حالتِ قید ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ کے مرنے کے بعد دیوجانس وہاں سے بھاگ کر ایتھنز چلا آیا اور یہیں رہنے لگا۔ یہاں اس کی حالت نہایت حقیر و ذلیل فقیروں کی طرح تھی، شہر کے اندر لکڑی لیکر ننگے پاؤں پھرتا اور پیٹھ پر ایک گٹھری رکھ کر سارے شہر کا گشت لگانا اس کا روز کا معمول تھا، جس پر لوگ ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے، خاص کر اسکی داڑھی تو لوگوں کے لئے کشت زعفران کی حیثیت رکھتی تھی اور اُن کی تضحیک اس پر صرف ہوا کرتی تھی۔

ان باتوں سے دیوجانس تمام باشندگان شہر کے لئے مسخرہ بن گیا تھا، لیکن باینہمہ اس نے فلسفۂ ادبیہ کی اشاعت بھی شروع کر دی اور اس مسئلہ میں وہ بالکل "انٹستھینز" کی تقلید کرنے لگا، یہ حالت اس کی دن بدن بڑھتی رہی اور نہایت استقلال کے ساتھ وہ نشر فضایل اور اشاعتِ علم میں مصروف ہو گیا اور اس قدر مصروف ہوا کہ اس کی اس علمی زندگی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا۔

وہ فلسفی خیالات جو اس کے دماغ میں پیدا ہوتے تھے اور جن کی یہ تبلیغ و اشاعت کر رہا تھا انٹستھینز کی تعلیمات کا نتیجہ تھیں اور اسی لئے وہ اس کا اس قدر دلدادہ ہو گیا تھا کہ تمام افعال و اعمال میں اسی کا رنگِ تقلید جھلکنے لگا تھا اور ہر شخص سمجھ سکتا تھا کہ دیوجانس کے جسم میں انٹستھینز کی روح حلول کر گئی ہے۔

عالم لوگوں کے نزدیک اگرچہ دیوجانس مسخرہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن پھر بھی جب وہ گھر سے باہر نکلتا تو ایک ہجوم اس کے ساتھ ہوتا لوگ سوال کرتے جاتے، وہ جواب دیتا رہتا۔ اور لوگ اس کے جوابوں کو یاد رکھتے، کیونکہ اس کے جواب میں ایک حقیقت مستور ہوتی تھی، جو دوسروں کو ضرورت کے وقت فایدہ پہونچاتی تھی، رفتہ رفتہ اس کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ شہر کے امراء و اکابر بھی اس کی جانب متوجہ ہو گئے یہاں تک کہ کوئی تقریب ایسی نہ ہوتی تھی جہاں دیوجانس کلبی خاص طور سے مدعو نہ کیا جاتا، وہ اپنے اس حال کو نہایت ہوشمندی و احتیاط کے ساتھ قایم کئے ہوئے، اپنی تبلیغی خدمات برابر کرتا رہا، کیونکہ جو تجربات اس کو مانسی میں ہوتے جاتے تھے وہ مستقبل کے لئے ہر آئینہ مفید ثابت ہو رہے تھے اور اس نے سمجھ لیا تھا کہ آیندہ کیونکر اپنی مساعی کو مشکور کر سکتا ہے، اور اب اُسے کس احتیاط سے کام کرنا چاہئے اسی لئے وہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ شریک ہونے لگا اور اُن کا ہم خیال ہو کر، اُن کا ہم آہنگ بن کر ان کی تربیت و تہذیب میں اصلاح کرنے لگا، حتیٰ کہ شہر کے ایک ایک متنفس کے نزدیک وہ مقبول اور ہر دلعزیز بن گیا اور اس بنا پر لوگوں نے اُسے کلبی کا لقب دیدیا، جو اس زمانہ میں (اس خیال کے زیر اثر کہ ان کی طبیعتیں کتوں سے مشابہ ہوا کرتی ہیں) فلاسفر کے لئے مخصوص تھا۔

دیوجانس نے ابتدا میں اپنے اوپر کیونیک مسخرہ کو جس طریقہ سے طاری کیا تھا، ہر چند اس کا اقتضا یہی تھا کہ لوگ اُسے

دیوانہ سمجھتے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس کی یہی دیوانگی اس قدر ہوشیاری تھی کہ تمام قلوب اس کی طرف منجذب ہوگئے اور چند ہی روز میں وہ نہایت قابل قدر فلسفی تسلیم کرلیا گیا۔

اشاعتِ فلسفہ کے لئے اس نے جو عجیب عجیب طریقے اختیار کئے تھے اُن کا درس اس نے جانوروں سے لیا تھا، چنانچہ چوہوں سے یہ سبق لیا کہ انسان کو کسی خاص مقام و مکان کی ضرورت نہیں، جہاں اتفاق لے جائے وہیں قیام بھی ہوسکتا ہے، اسی لئے اس نے اپنے رہنے کے لئے کوئی مکان نہیں بنایا۔ بلکہ اپنے ساتھ ایک صندوق رکھنے لگا۔ جسے آگے آگے لڑھکاتا ہوا چلتا اور جب رات ہوجاتی اس میں گھس جاتا۔

وحشی جانوروں سے اس نے یہ سیکھا کہ کھانا پکانے اور برتن وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، کچا گوشت ناخنوں سے نوچ کر کھایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس کا طرزِ عمل یہی تھا اور سوائے ان صورتوں کے جبکہ وہ کسی دعوت میں شریک ہوتا، یا خاص مجمع میں مدعو کیا جاتا، اسی طرح ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھاتا۔

کتوں سے اس نے یہ حقیقت حاصل کی کہ سنجیدگی و متانت یا پابندی رسوم کی کوئی ضرورت نہیں تمام مطالب و مقاصد پورا کرنے کے لئے صرف آزادی و بیباکی درکار ہے۔ اگرچہ لوگ دیوجانس کی ان حرکتوں کو حیرت و استعجاب سے دیکھتے تھے لیکن خود دیوجانس دوسروں پر افسوس کرتا تھا کہ وہ کیوں اس کے اصول پر عمل نہیں کرتے۔

کلبی کی عادت تھی کہ وہ دن کو بھی ایک قندیل اپنے ساتھ لیکر نکلتا اس پر اگر لوگ پوچھتے کہ یہ کس ضرورت سے ہے تو جواب دیتا کہ مجھے اپنے ایک ہم مشرب کی تلاش ہے، چنانچہ وہ لوگوں کو آواز دیتا اور اپنے پاس جمع کرتا، جب سب آجاتے تو ڈنڈا لیکر ان کو منتشر کردیتا اور کہتا مجھے انسان کی تلاش ہے اور تم میں سے کوئی انسان نہیں ہے۔ اس کے جواب میں اگر کوئی کہتا کہ "پھر آدمی کسے کہتے ہیں، تم نے کبھی کسی آدمی کو دیکھا ہے؟ تو کہتا کہ "نہیں میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا، البتہ اسپارٹا میں چند بچے دیکھے ہیں"۔

دیوجانس کا یہ جواب ٹھیک ہوتا اگر وہ انسانی حقیقت سے بھی واقفیت رکھتا، لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقوال صرف اوہام تھے اور لوگوں کے معائب پر اُن کے محاسن سے زیادہ غور و خوض کیا کرتا تھا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ لوگوں نے اُس کو دیکھا، بتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ مانگ رہا ہے اور ایک کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا تو دوسری کی جانب متوجہ ہوجاتا ہے، دوسرا بھی کچھ نہیں بولتا، تو تیسرے کو مخاطب کرتا ہے، وہ بھی خاموش رہتا ہے تو چوتھے کو دیکھنے لگتا ہے، لوگوں نے پوچھا، "تم اس سے کیا چاہتے ہو؟" کہنے لگا "میں لوگوں کے پاس اپنی کوئی خواہش لے کر جاتا ہوں تو وہ بھی ان ہی بتوں کی طرح بجس و حرکت رہتے ہیں، اس لئے میں ان بتوں سے التجائیں کرکے، لوگوں سے مانگنے اور نہ پانے کا خوگر رہا ہوں"۔

اس کی یہ عادت بھی تھی کہ موسم گرما میں جب سخت گرمی پڑنے لگتی، تو دوپہر کے وقت خوب گرم ریت پر اور جب شدید جاڑے ہوتے تو برف کی چٹانوں پر لوٹتا، لوگ پوچھتے یہ کیوں، تو کہتا اس سے مجھے سردی و گرمی برداشت کرنے کی عادت پڑجائے گی۔

وہ ذی ثروت اور دولتمند اصحاب کی تحقیر کرتا، خطیبوں اور مقررین کو سمجھتا کہ یہ رعایا کے غلام ہیں۔ فلاطون اور اسکے تلامذہ کے لئے اس کی رائے یہ تھی کہ وہ سب کے سب فضول خرچ تھے۔ اس کا قول تھا کہ بادشاہوں کے تاج ایسے ہیں، جیسے شیشے کے برتن اور شہرت پسندی صرف دیوانوں کا شیوہ ہے، وہ کہا کرتا کہ جب میں دنیا کے حکام، فلاسفہ و حکماء وغیرہ کو دیکھتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ واقعی انسان اپنے عقل و ادراک کے لحاظ سے جانوروں سے بالاتر ہے۔ لیکن جب میں اُن لوگوں کو دیکھتا ہوں جو وحی، الہام، تعبیر رویا کے مدعی ہیں یا ان لوگوں پر نظر پڑتی ہے جو مال و جاہ حاصل کرنے کے بعد متکبر و مغرور بن جاتے ہیں، تو خیال کرتا ہوں کہ انسان سخت مجنون ہے اور اس لحاظ سے حیوانوں سے بھی زیادہ پست و ذلیل۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا چُلّو سے پانی پی رہا ہے، اس نے اپنا چوبی پیالہ پھینک دیا اور کہا یہ بچّہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور صاحبِ بصیرت ہے۔

وہ اس شخص کی بہت زیادہ تعریف کرتا جو شادی کے لئے طیار تو ہوتے مگر شادی نہ کرتے، کیونکہ اس کے نزدیک جو جوانی میں شادی کر لیتا تھا وہ عجلت کرتا تھا اور جو انحطاط کے بعد آمادہ ہوتا تھا وہ تاخیر کر دیتا تھا اور اس لئے دونوں میں سے کوئی ایک اُسے پسند نہ تھا۔

ایک روز بازار میں کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا، دیکھا تو پاس ایک متنفس بھی نہیں۔ گانا بجانا شروع کر دیا، پھر تو کیا تھا، لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے، تھوڑی دیر تک یہ حالت دیکھتا رہا اور اس کے بعد سب کو لعنت ملامت کرنے لگا کہ "افسوس ہے کہ تم ایک لغویات کے لئے میرے گرد جمع ہو گئے، لیکن میری دریں نصائح کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔

دیوجانس ان لوگوں کا سخت مخالف تھا جو موسیقی میں کوئی مہارت رکھتے تھے، وہ کہتا تھا یہ لوگ بجائے اس کے کہ لوگوں کے خصایل میں اصلاح، عادات میں استقلال، تہذیب میں استقامت پیدا کریں۔ ان کو خوش اور لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن میں وہ بیکار ہو جاتے ہیں۔

علمائے فلکیات اور اہل رصد کا بھی بڑا مخالف تھا اور کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کا تو حال معلوم نہیں اور آسمان و اجرام سماوی کے حالات جاننے کے مدعی ہیں۔

خطیب اور واعظ حضرات سے بیزار تھا، اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے، نجیبوں کا بھی دشمن تھا، انکی نسبت اس کی یہ رائے تھی کہ ظاہر میں تو ان پر زہد و قناعت کے آثار ہوتے ہیں، لیکن دل میں صرف مال جمع کرنے اور دُنیا کی حرص ہوتی ہے جو لوگ معابد و ہیاکل میں جاکر طاعت و عبادت کرتے ہیں اور باہر نکل کر ملاہی و ملاعب میں شریک ہو جاتے ہیں اُن سے بھی اُسے سخت نفرت تھی وہ کہتا تھا ایسے تو بہت لوگ میں نے دیکھے ہیں جو مذاق اور فضولیات میں اپنا وقت ضایع کر دیتے ہیں۔ مگر انسانی فضایل اور اخلاقی کمالات حاصل کرنے میں ایک منٹ بھی صرف نہیں کرتے۔

ایک روز دیوجانس ایک شخص کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے نکلا، اور ایک عظیم الشان محل کی جانب جا نکلا۔ یہ محل نہایت آراستہ اور شاندار سنگِ مرمر کا بنا ہوا تھا اور اُس پر سونے کا کام بھی تھا۔ جب اس نے تمام محل کی سیر کر لی اور اُسے نہایت صاف و ستھرا پایا تو اپنے رفیق کے منہ پر تھوک دیا اور کہا "معاف فرمایئے، مجھے تھوکنے کی ضرورت تھی اور آپ کے منہ سے زیادہ اس کام کے لئے کوئی میلی جگہ مجھے نظر نہ آئی، جہاں تھوک سکتا۔"

ایک روز دیوجانس ایسی جگہ پہونچا، جہاں لڑکے کھیل رہے تھے۔ خود بھی وہیں کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں نے اُسے گالیاں دیکر نکال دیا تو چلا تو آیا، لیکن اُن سب کے نام بھی لکھ لایا تاکہ شہر میں گشت کر کے اُن کا اعلان کرے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس کے فقر و فاقہ پر ملامت کرنی اور شرم دلانی شروع کی، اُس نے کہا فقیر ملامت کا مستحق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ ہیں جو مالدار ہیں اور رات دن قبائح و رذایل میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اچھی چیز وہ ہے جو سستی ہو، مٹی سنگِ مرمر کی تصویریں دیکھی ہیں جو ہزاروں روپے میں فروخت ہوتی ہیں لیکن ایک من گیہوں کے مقابلہ میں میں ان کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا جو ایک روپے میں آجاتا ہے۔

ایک روز وہ حمام میں گیا اور دیکھا کہ پانی بہت میلا ہے، حمام والے سے پوچھا جو شخص یہاں نہاتا ہے وہ اپنا بدن کہاں جاکر پاک کرتا ہے۔

ایک روز لوگ اُسے فیلپس مقدونی کے پاس پکڑ لائے، فیلپس نے پوچھا "تم کون ہو" جواب دیا "تمھاری طرح ایک جاسوس"

اُس نے اس فقرہ کو بہت پسند کیا اور اُسے چھوڑ دیا۔

اس کا قول تھا کہ حکماء کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، تمام چیزیں اُن کے قبضے میں ہیں، وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ ہر چیز خدا کی ہے اور یہ لوگ خدا کے محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ سکندر اس کی ملاقات کو گیا اور دیکھا کہ وہ دھوپ میں بیٹھا ہے اور اُس کا صندوق بھی پڑا ہے، سکندر نے اس کے پاس جاکر کہا کہ "میں سکندر ہوں" وہ بولا "میں دیوجانس کتا ہوں"۔ سکندر نے کہا "تم مجھ سے ڈرتے نہیں ہو؟" اس نے کہا "تم نیک ہو یا بد" اس نے جواب دیا "نیک"۔ کہنے لگا "تو پھر نیک آدمی سے کیوں خوف کروں"۔ سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا، پھر اس سے کہا کہ "تم اپنی کوئی حاجت میرے سامنے پیش کرو میں پوری کروں گا"۔ کہا "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ، تم نے دھوپ روک لی ہے"۔ اس نے کہا کہ "ہم دونوں میں کون زیادہ بے پرواہ ہے، ایک کمبل اور ایک گٹھری والا یا وہ شخص جو اپنی وسیع سلطنت اور عظیم الشان حکومت پر قانع نہیں ہے بلکہ بقیہ دنیا کو قبضہ میں لانے کے درپے ہے اور مفت میں اپنی جان خطرات میں ڈال رہا ہے"۔ سکندر کے رفقاء بہت متعجب ہوئے، خاص کر جب انھوں نے دیکھا کہ باوجود اس شخص کی بیباکی اور جرأت کے سکندر کے دل میں کچھ اور عزت بڑھتی جارہی ہے، سکندر نے اس کو محسوس کیا اور اپنے رفقاء کو مخاطب کرکے کہنے لگا: "اگر آج میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس ہوتا۔

دیوجانس ایک مرتبہ جہاز کا سفر کر رہا تھا، دریائی ڈاکو آئے اور اسے پکڑ لے گئے اور جزیرۂ کریٹ میں ایک غلام کی صورت سے بیچنے لگے، اس نے ایک موٹے شخص کو دیکھا جو اچھے وضع اور لباس میں تھا کہنے لگا "مجھے اس شخص کے ہاتھ بیچ دو، اس کو ایک معلم و مؤدب کی ضرورت ہے"۔ اس شخص کا نام زیناڈس تھا، دیوجانس اس شخص کی طرف بڑھا اور کہا، بیٹے مجھے خرید لو، میں تمھیں تعلیم دوں گا اور ادب سکھاؤں گا، زیناڈس نے پوچھا تم کیا جانتے ہو، بتایا میں تہذیب و تربیت کے اصول سے واقف ہوں، آخر کار زیناڈس نے خرید لیا۔ جب اسے لیکر چلا تو دیوجانس نے کہا میں تمھارا غلام تو ہو گیا ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا، زیناڈس نے اُسے اپنے لڑکوں کا معلم مقرر کیا، دیوجانس نے بڑی کوشش سے ان کی تعلیم و تربیت کی اور انھیں شعر گوئی، حکمت، پہلوانی، شکار اور تیر اندازی وغیرہ سکھائی اور قناعت کرنے اور موٹا کپڑا پہننے کی انھیں ترغیب دی

ایک روز ایک شخص اُس کے پاس آیا جو اُسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ دیوجانس نے اُس سے کہا "تمھیں نہیں معلوم کہ وہ شخص جو شیر کو کھلاتا، پلاتا ہے خود شیر کا قیدی ہے، شیر اُس کا قیدی نہیں ہوتا"

ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ کھانے کے لئے کون سا وقت مناسب ہے، اس نے کہا کہ اگر تم مالدار ہو تو جب چاہو کھاؤ، اور اگر فقیر ہو تو جب مل جائے وہی وقت مناسب ہے۔

اس کی عجیب عادت یہ تھی بجائے سر کے پاؤں میں خوشبو لگاتا تھا لوگوں نے دیکھ کر یہ پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے تو جواب دیا کہ سر میں خوشبو لگانا فضول ہے، کیونکہ وہ ہوا کے ساتھ پھیل کر ضائع ہو جاتی ہے اور آدمی اس سے زیادہ فایدہ نہیں اُٹھا سکتا اور اگر پاؤں میں لگائی جائے تو اس سے ہر وقت فایدہ پہونچ سکتا ہے۔

ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر تم میری ملاقات کو نہ آؤ گے تو میں تمھیں قتل کر دوں گا، اُس نے کہا یہ تو کوئی کمال کی بات نہیں ایک چھوٹا سا زہریلا کیڑا بھی یہ کام کر سکتا ہے۔

ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ حکام ایک چور کو سزا دے رہے ہیں، جس نے سرکاری خزانے سے ایک برتن چرایا ہے، دیوجانس نے کہا بڑے چور چھوٹے چور کو سزا دے رہے ہیں۔ جب اُسے کوئی ضرورت ہوتی اور کسی کے پاس مانگنے جاتا تو اس سے کہتا تھا کہ "تم نے مجھ سے پہلے کسی اور کو بھی دیا ہے یا نہیں۔ اگر دیا ہے تو اسی طرح مجھے دو، اور نہیں دیا تو مجھی کو وہ پہلا شخص قرار دو،

جسے تم اپنی عمر میں سب سے پہلے کچھ دینے والے ہو"

وہ کہا کرتا تھا کہ شہوت مصائب کی جڑ ہے، علماء معبود کے مظاہر ہیں، پیٹ زندگی کا وبال ہے، عشق بیکاری کا مشغلہ ہے بڑھاپا اور افلاس دونوں بلا ہیں اور دنیا میں سب سے بہتر چیز آزادی ہے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ لوگ اندھوں اور لنگڑوں کو دیتے ہیں اور فلاسفہ کو نہیں دیتے، اس کی کیا وجہ ہے، اس نے جواب دیا کہ وہ ڈرتے ہیں، کسی روز اندھے یا لنگڑے نہ ہو جائیں، مگر فلسفی ہونے کا انھیں ذرا بھی خوف نہیں۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ہی تو کھوٹے روپئے بنایا کرتے تھے، کہا کہ جب میں تمھاری طرح تھا، لیکن اب میں اس مرتبہ پر پہونچ گیا ہوں، جسے تم عمر بھر حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص تیر چلا رہا ہے اور کبھی اس کا تیر نشانہ پر نہیں لگتا، دیوجانس نے جاکر اپنا سر نشانہ کی جگہ لگا دیا اور کہا کہ اور کہیں تو مجھے خوف ہے کہ تیر نہ لگ جائے، لیکن یہاں تو میں اطمینان سے رہ سکتا ہوں۔

لوگوں نے اس سے کہا کہ تم بازاروں میں کیوں کھاتے پھرتے ہو، کہا کہ جس طرح گھر میں بھوک لگتی ہے اسی طرح بازار میں بھی لگتی ہے، لوگوں نے کہا کہ یہ عادت تو تمھاری کتوں کی طرح ہے، اس نے کہا کہ کتے تم ہو جو کھانے والے کے پاس جمع ہو گئے ہو۔

وہ کہتا تھا کہ جو لوگ وعظ و نصیحت کرتے ہیں وہ خود اس پر عمل نہیں کرتے وہ آلات موسیقی کی طرح ہیں جن سے نہایت دل خوش کن نغمات نکلتے ہیں اور خود وہ بے شعور و بے حس ہیں۔

لوگوں نے اس سے کہا کہ جب تم مرو تو تمھیں کہاں دفن کریں، کہا جنگل میں ڈال دینا، لوگوں نے کہا کہ درندے کھا جائیں گے کہا میرے پاس ایک لکڑی رکھ دینا، اگر کوئی کھانے آئے تو بھگا دوں گا، لوگوں نے کہا کیا مرنے کے بعد بھی تم ایسا کر سکو گے، جواب دیا کہ میں کچھ نہ کر سکوں گا تو مجھے کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی، پھر اس کی فکر کیا کہ میں کہاں دفن ہوں گا۔

دیوجانس کے اس قسم کے نوادر نہایت کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔ ۹۰ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا، مشہور یہ ہے کہ جس روز سکندر کا انتقال ہوا تھا، اسی روز اس نے بھی وفات پائی، موت کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ گائے کا ایک پیر کچا کھا گیا اور اسے ہضم نہ کر سکا اور مر گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ خود اس نے اپنی سانس روک لی تھی، یونانیوں نے اس کی قبر پر ایک مجسمہ کتے کا بنا دیا تھا اور اس کی مختصر سیرت بھی قبر پر لکھ دی تھی۔

نسبتی تھا نیسری

مے باقی و ماہتاب باقی ست — مارا بہ تو صد حساب باقی ست

کار پروانہ کار آساں نیست — بلبلاں فکرِ سوختن مکنید

پارۂ دل بہ جگر، لختِ جگر بر روے دل — پارہ را دوختم اما پریشاں دوختم

پرسید زمن یار کہ احوالِ تو چون ست — تا حال با و شرح دہم حالِ دگر شد

آتشِ افسردۂ از کارواں واماندہ ام — ہمرہاں رفتند و خاکستر نشینم کردہ اند

بہار رفت و ز دیوانگی ندانستم — کدام باغ، کدام چمن، کدام گل ست

"گاہے گاہے باز خواں ——"

مذہب تمدنی نقطۂ نظر سے

ایک زمانہ عاقل و ذی ہوش انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب مذہب سے انکار تو خیر بڑی چیز ہے اس کی حقیقت پر غور کرنا بھی معصیت خیال کیا جاتا تھا اور اس قسم کی بحث گویا توہین خداوندی کے مترادف تھی چنانچہ اُنیسویں صدی کے وسط تک اس مذہبی گرفت اور ذہنی غلامی کا یہ عالم تھا کہ کائنات کو انسان نے خدا اور شیطان کے درمیان تقسیم کر رکھا تھا، یعنی تمام اچھی باتیں خدا سے منسوب کی جاتی تھیں اور بُری باتیں شیطان سے۔ گویا انسان ایک نہایت ہی ذلیل قسم کا جانور تھا جو نہ خود کوئی بات کر سکتا تھا اور نہ وہ کسی امر کا ذمہ دار قرار پا سکتا تھا۔

لیکن اب کہ دُنیا کی ہر چیز اور ہر کیفیت پر علمی و تحقیقی نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے اور ایک ایک ذرہ سے لیکر پہاڑوں کی سر بفلک چٹانوں تک کوئی چیز ایسی نہیں جو مطالعۂ علم و تحقیق سے باہر ہو، مذہب کا بچنا دشوار تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ علم کی دراز دستی سے محفوظ رہ سکتا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ علم یا سائنس کی رسائی مذہب تک نہیں، لیکن یہ غلط ہے، کیونکہ سائنس کا تعلق جس طرح مادی چیزوں سے ہے اسی طرح غیر مادی اشیاء سے بھی ہے۔ اگر وہ کمیت سے بحث کرتا ہے تو کیفیت بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ چنانچہ نفسیات جس کا تعلق نفس ہے وجدانیات یا جمالیات جس کا تعلق حسن و جمال سے ہے اخلاقیات جو انسان کے اخلاق سے متعلق ہے اور اسی طرح کے دیگر علوم سب غیر مادی چیزوں سے بحث کرتے ہیں۔

سائنس فی الحقیقت نام ہے ایک صحیح اور بے لاگ انتقادی مطالعہ کا خواہ اس کا موضوع کوئی مادی چیز ہو یا غیر مادی اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ مذہب جو ہزاروں سال سے انسانی رجحانات پر حکمرانی کرتا چلا آرہا ہے۔ محض اس لئے کہ اس کا تعلق روح و روحانیات سے ظاہر کیا جاتا ہے، تحقیق علمی کے حدود سے باہر رکھا جائے۔ چنانچہ آج کی صحبت میں ہم اس موضوع پر خالص علمی نقطۂ نظر سے غور کر کے دیکھیں گے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور وہ انسانیت کے لئے ضروری ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آیا مذہب واقعی کوئی الہامی چیز ہے، یعنی کیا خدا کی طرف سے اسکی پابندی انسان پر عاید کی گئی ہے اور اس کے بعد یہ کہ اگر الہامی نہیں ہے تو اس کے وجود کے اسباب کیا تھے۔

اگر ہم اس کو تسلیم کر لیں کہ مذہب کا مقصود نوع انسان کی فلاح و بہبود ہے تو ہم کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا نے انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی ساتھ مذہب بھی الہام کیا ہوگا ورنہ اس کے یہ معنے ہوں گے کہ خدا نے اول اول تو ہدایت کو ضروری خیال نہ کیا تھا لیکن بعد کو اس کی ضرورت اس نے محسوس کی جو یقیناً شانِ خداوندی کے منافی ہے، اگر خدا کا مقصود انسان کی آفرینش سے کوئی بے معنی کھیل نہ تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اولین عہد کے انسان کی پروا نہ کرتا اور زمانۂ بعد کے انسانوں کو قابل توجہ سمجھتا جبکہ اصولاً تو وارد انسان کو حقیقتاً زیادہ تنبیہ و ہدایت کی ضرورت تھی لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ عہد مابعد کے تمام تر مذاہب جن میں اسلام اور عیسویت کو زیادہ نمایاں درجہ حاصل ہے صرف اپنے ہی کو الہامی مذہب قرار دیتے ہیں اور قرون ماضیہ کو عہد تاریک، دور جاہلیت، زمانۂ وحشت و بربریت کے ناموں سے یاد کر کے گویا یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس زمانہ کے لوگ

بالکل گمراہ تھے اور وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے پھر اس اعتراض کا جواب کہ خدا نے کیوں ایک طویل زمانہ تک انسان کو گمراہ رکھا اور کیوں نہ ان میں کوئی نبی یا پیغمبر بھیجکر صراطِ مستقیم سے آشنا کیا، ہم پر عاید نہیں ہوتا بلکہ ان پر جو اپنے آپ کو اسلامی مذاہب کا پابند بتاتی ہیں۔

وہ حضرات جو اثریات سے دلچسپی رکھتے ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ انسان کے عہدِ حجری کی جو چیزیں (لاکھوں سال قبل کی) اس وقت تک زمین سے برآمد ہوئی ہیں۔ وہ مشتمل ہیں صرف چند مخصوص آلات و اوزار پر اور ان کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی دستیاب نہیں ہوئی جس سے یہ پتہ چلتا کہ وہ خدا یا مذہب کے وجود کا بھی قایل تھا۔ البتہ اب سے ۲۰ ہزار سال قبل کی چیزوں میں ضرور ہاتھی دانت یا پتھر کے ایسے نقوش یا بُت دریافت ہوئے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ مذہبی خیالات کے زیر اثر بنائے گئے ہوں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسان کے وجود کے ساتھ مذہب کا وجود ظہور میں نہیں آیا اور اسی لئے یہ دعوے کرنا کہ مذہب کا خیال بالکل فطری چیز ہے یا یہ کہ اس کا تعلق الہام خداوندی سے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

علوم جدیدہ کے مسایل میں، مذہب کو سب سے زیادہ نقصان جس چیز نے پہونچایا ہے وہ مسئلہ ارتقا ہے کیونکہ اسنے ثابت کر دیا ہے کہ ہر چیز خواہ وہ مادہ سے متعلق ہو یا نفس سے ماحول کے زیر اثر تدریجاً آگے بڑھتی ہے اور پھر چونکہ مذہب کا خیال غذا یا پوشش کی طرح فطری مجبوری کا نتیجہ نہ تھا اس لئے ظاہر ہے کہ اس کا وجود بھی اسباب معیشت و ماحول کے زیر اثر ظہور میں آیا ہوگا، اور ایک قوم پر جو زمانہ جس حال میں بسر ہوا ہوگا اسی کے تحت اس کے مذہبی خیال میں بھی تبدیلی پیدا ہوگی۔ قیام مذہب کی بنیاد، وجود خدا کے عقیدہ پر قایم ہے اور خدا کا تصور جس جس طرح مختلف اوقات میں انسان نے کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا خالق کہنا شاید اتنا موزوں نہیں ہے، جتنا انسان کو خدا کا خالق کہنا۔

علم الانسان اور تاریخ مذہب کے ماہرین اس باب میں مختلف الخیال ہیں کہ خدا کا وجود ذہن انسانی میں سب سے پہلے کب اور کیونکر آیا، بعض کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا قوای فطرت یا فطری اشیاء کے مطالعہ سے ہوئی ہے یعنی آسمان و زمین میں جو چیز یا جو قوت انسان کو مفید یا عجیب نظر آئی اسی کو وہ پوجنے لگا، چنانچہ، درخت، پتھر، پہاڑ، ستارے، چاند، سورج وغیرہ مختلف مظاہرِ فطرت کو انسان نے خدا سمجھا اور ان کی پرستش شروع کر دی۔ بعض کے نزدیک اس کا تعلق قبایل کے سرداروں اور اسلاف کی یاد سے ہے۔ یعنی قبایل کے جن لوگوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے اور آباو اجداد میں سے جو افراد مر گئے احتراماً ان کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرنے لگے۔

قدیم روما و یونان میں بھی ایک جماعت مشککین و قائلین ارتقاء کی پائی جاتی تھی اور انھوں نے بھی قیاس آرائیوں سے کام لے کر عقیدۂ خدا کے متعلق مختلف نظریے قایم کئے تھے، چنانچہ انھیں میں سے ایک شاعر لکریتیس کہتا ہے کہ "سب سے پہلے جس چیز نے زمین پر خدا کو پیدا کیا وہ انسان کا جذبۂ خوف و ہراس تھا"، بجلی کی کڑک، طوفان کے شور سمندروں کے تلاطم آتش فشاں پہاڑوں کے خوفناک مناظر وغیرہ یہ تمام وہ چیزیں تھیں جن سے ڈر کر انسان کو خیال پیدا ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور قوت بھی موجود ہے۔

ہربرٹ اسپنسر کا نظریہ یہ ہے کہ "انسان اول اول سمجھتا تھا کہ انسان کا سایہ یا ہمزاد اس کے مرنے کے بعد بھی قایم رہتا ہے، اس لئے اگر کوئی سردار مر گیا ہے تو اس کا ہمزاد ضرور باقی ہے اور یہیں سے دیوتا کا وجود اس کے ذہن میں آیا" الغرض خدا یا دیوتاؤں کا وجود خود انسان کا پیدا کیا ہوا ہے جس کو اس نے اپنے جغرافی و معاشرتی ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں اور رنگوں میں پیش کیا۔ چنانچہ اسپنسر کہتا ہے کہ "اگر مثلث کا کوئی خدا ہوتا تو وہ اسے مثلثی شکل کا تصور کرتا"۔ رہا یہ امر کہ خدا کے تصور میں خود انسان کا ذوق کس حد تک کارفرما ہے سو مختلف قوموں کے دیوتاؤں اور بتوں کے دیکھنے سے اس کا

حال بخوبی معلوم ہو سکتا ہے۔

حبشیوں کے دیوتا کا رنگ کالا ہوتا ہے اور ناک چپٹی ماہل تھرتیس کا دیوتا نیلگوں آنکھیں رکھتا ہے اور سرخ بال۔ اور ہومر و ہیسڈ کا خدا تمام وہ معائب رکھتا ہے جو خود اس عہد کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ مغرب میں زیادہ ارتقائی درجہ کا خدا دیکھنا ہو تو عہد عتیق کے خدا (Elohim) کو دیکھئے جس نے دنیا کو چھ دن میں پیدا کیا اور تھک کر آرام کرنے پر مجبور ہوا۔ آدمیوں ہی کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں ہیں اور انسان ہی کی طرح وہ جذبات سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ اس نے آدم کے لئے جانوروں میں سے رفیق زندگی پیدا کیا، آدم و حوا کے لئے کھال کا ملبوس طیار کیا، برج بابل دیکھنے کے لئے وہ خود زمین پر اتر آیا، وہ ظالم و خونخوار ہے، رشک و حسد کرتا ہے انسانی قربانیاں چاہتا ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتا بھی ہے۔

الغرض خدا کا مفہوم ہمیشہ انسانی حالات کے تحت بدلتا رہتا ہے استبداد و ملوکیت کے دور میں اگر وہ ایک بادشاہ ہے تو عہد جمہوریت میں اس کی حیثیت ایک پریسیڈنٹ سے زیادہ نہیں رہ سکتی۔ ترقی سائنس سے قبل وہ محیر العقول معجزے بھی دکھاتا تھا لیکن اب ترقی علوم کے زمانہ میں وہ بالکل قانون فطرت کا پابند ہے۔

بعض اسے مہربان، محبت کرنے والے باپ کی طرح سمجھتے ہیں، بعض کے نزدیک وہ ایسا ظالم ہے کہ غیر بپتسمہ شدہ بچوں کو دوزخ میں ڈال دیتا ہے اور منکرین کو خواہ کتنے ہی اخلاق کے کیوں نہ ہوں ہمیشہ آتشِ جہنم کے عذاب میں مبتلا رکھے گا۔ پھر اس "خدا تراشی" کے ساتھ ہی جب ہم اس کے نتائج کو دیکھتے ہیں تو اور زیادہ حیرت ہوتی ہے کہ انسانیت کیونکر اتنے عرصہ تک اسے برداشت کر سکی۔ بے زبان جانوروں کی قربانیوں کے علاوہ انسانی بچوں اور عورتوں کا ذبح کیا جانا، سحر و جادو کے الزام میں ہزاروں ضعیف عورتوں کو آگ میں ڈال دینا۔ منکرین کو بیدردی سے تہ تیغ کر دینا یہ تمام وہ مظالم تھے جو مذہب کے پردہ میں روا رکھے گئے کیونکہ جن لوگوں نے خدا کے تصور کو دنیا کے سامنے پیش کیا اُن کے دل یکسر نفرت و تعصب سے لبریز تھے اور خدا کا مفہوم ہی وہ اس طرح پیش کرتے تھے کہ انھیں اپنے جذبات پورا کرنے کا موقع ملے حقیقت یہ ہے کہ دیوتاؤں کا وجود خود انسان کے احساس و ضروریات کی ایک مجسم صورت تھی اور یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ گویا ایک "مہیب سایہ" تھا خود انسان کے خیالات کا۔

اب اسی کے ساتھ اس کے ترقی یافتہ زمانہ کو دیکھئے کہ خدا کا مفہوم متعین کرنے کے لئے کس قدر عجیب و غریب ذہانت و انشاء سے کام لیا گیا ہے۔

ایک فلاسفر کہتا ہے کہ خدا "عدیم التاثر قادر مطلق (Passionless Absolute) ہے ایمرسن اُسے کائنات کی روح برتر و اعلیٰ over Soul of the Universe کہتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر اسے "ابدی و ازلی قوت" (Divine Hore) تعبیر کرتا ہے۔ ولیم جیمس اسے (Infinite & eternal energy) کے الفاظ سے سمجھنا چاہتا ہے، برگساں اسے "محرک جوہری" (Vital Impulse) کے الفاظ سے ظاہر کرتا ہے، برنارڈ شا نے اسے قوتِ حیات (Life force) کہا ہے۔ پروفیسر کرساپ اسے ایک "غیر مادی حقیقت" (Totality Immaterial Reality) سمجھتا ہے۔ ہوریس برجز اسے "کائنات کا خیر کل" (of good in the world) بتاتا ہے۔ بعض اُسے "فضاء کوکبی کی روح" سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض اسے دنیا کا انکل سام[1] (Uncle Sam) اور بعض اسے ایسا "روحانی ایتھر" سمجھتے ہیں جو وسعتِ زماں کو معمور کئے ہوئے ہے۔

---

[1] انکل سام سے مراد امریکہ ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام تعبیرات کا واقعی کوئی مفہوم ہے، کیا کوئی شخص ان تعبیرات سے خدا کے مفہوم کو متعین کر سکتا ہے کیا ان کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ اس نے خدا کی حقیقت کو سمجھ لیا۔

اس سے قبل جب انسان جاہل تھا اور اس کا ذہن زیادہ ترقی یافتہ نہ تھا اس نے خدا کو مادی و مرئی چیزوں کی صورت میں پیش کیا جو ہر چند قابل قبول نہ تھا لیکن قابل تصور و قیاس تو تھا، مگر اب اس دور علم و ترقی میں تو خدا کو اس قدر مبہم بنا دیا گیا ہے کہ سوائے ذہنی مالیخولیا کے ہم کسی اور چیز سے تعبیر کر ہی نہیں سکتے، چنانچہ جو بیانات ابھی پیش کئے گئے ہیں، آپ ان کے سمجھنے کے لئے پوری قوت صرف کر دیجئے لیکن آپ کسی متعین مفہوم تک پہونچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ صرف الفاظ و تراکیب ہیں، جو مفہوم سے بالکل بیگانہ ہیں اور ان پر غور کرنا سوائے لایعنی ذہنی کشمکش کے اور کوئی معنی نہیں رکھتا الغرض خدا صرف ذہن انسانی کی پیداوار ہے اور اختلاف ذہن کے ساتھ اس کا مفہوم بھی ہمیشہ بدلا ہے۔ جب انسان کی نگاہ مادی چیزوں سے ہٹ کر کسی اور طرف نہیں جا سکتی تھی تو اس نے درختوں، جانوروں، پہاڑوں، دریاؤں اور انسانی بتوں کی صورت میں خدا کو سمجھنا چاہا اور اب کہ عقول انسانی نے ترقی کر کے خالص کیفیات کی تحلیل شروع کر دی ہے، خدا کا نام رہ گیا ہے صرف ان لغو و مہمل تاویلات کا جو دماغ کو اور زیادہ تشویش میں مبتلا کر دینے والی ہیں۔

مذہب یا خدا کے وجود کا خیال الہامی چیز ہے اس کی تردید خود الہامی مذاہب کے بیانات سے ہوتی ہے کیونکہ وہ عہد وحشت کے لوگوں کو گمراہ سمجھتے ہیں اور ان کی بت پرستی کو خلاف منشاء خداوندی قرار دیتے ہیں، اب رہ گیا یہ امر کہ وہ کوئی فطری چیز ہے اور انسان نے پیدا ہوتے ہی سمجھ لیا تھا کہ خدا کا وجود ضروری ہے، سو میرے نزدیک اہل مذاہب اس کا ثبوت بھی پیش نہیں کر سکتے

اس مسئلہ کی چھان بین کے لئے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ خود وحشی اقوام کے زمانہ کو ہم "زمانۂ قبل تاریخ" سے موسوم کرتے ہیں، اور اس لئے ہمارے پاس کوئی ذریعہ ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے کا نہیں ہے۔ لیکن چونکہ دنیا اس وقت بھی ان قوموں سے خالی نہیں ہے، اس لئے ان کی موجودہ حالت سے ان کی گزشتہ حالات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

اس وقت انتہائی پست درجہ کی قومیں ٹراڈل فگو، برازیل، نگا، جزایر فیلپائن، جزیرہ نمائے ملایا اور جنوبی افریقہ میں پائی جاتی ہیں، ان کی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبایلی زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور دماغی پستی کا یہ عالم ہے کہ ان میں قبایلی زندگی کا بھی کوئی نظام نہیں پایا جاتا اور دماغی پستی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ ایک سے زیادہ گنتی بھی انھیں نہیں آتی اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیونکر پیدا کی جاتی ہے۔

ٹراڈل فگو کی وحشی قوم یہگان کے متعلق کامل دو سال تک فرانسیسی علماء نے تحقیق کر کے جو رپورٹ شایع کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ خدا کے وجود کے قایل ہیں نہ ان کے نزدیک خیر و شر کا کوئی مفہوم ہے۔ امید و خوف کا بھی کوئی جذبہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا اور موت کے بعد وہ کسی اور عالم کے قایل نہیں ہیں۔

وسط برازیل کی وحشی اقوام کے عقاید میں بھی کوئی مذہبی جھلک نظر نہیں آتی، سوا اس کے کہ وہ سورج کو اچھا سمجھتے ہیں اور چاند کو برا۔ جس کا سبب غالباً صرف یہ ہو سکتا ہے کہ چاند کا تعلق رات سے ہے جب درندے جنگل سے باہر نکل آتے ہیں اور سورج کا دن سے جب درندوں کا خوف نہیں رہتا، یہ کسی کی پوجا نہیں کرتے اور نہ ان کا کوئی بت ہے۔ نگا کی قدیم وحشی جماعتوں میں بھی کسی مذہبی پرستش کا وجود نہیں پایا جاتا اور ان کی زندگی کے کسی شعبہ سے اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ وہ خدا یا دیوتا کے قایل ہیں۔

ٹسمانیا کے صحرائی قبایل کے متعلق ڈاکٹر ٹکسن لکھتا ہے کہ:- "ان میں کسی مذہبی رسم کا پتہ نہیں چلتا اور یہ اپنے خیالات کے لحاظ سے بھی اتنے پست ہیں کہ ان کی زبان زیادہ تر اشارات پر مشتمل ہے، چنانچہ رات کے وقت تو یہ آپس میں

باتیں کر ہی نہیں سکتے۔

جزائر انڈمان کے وحشی قبایل ہر چند دوسری قوموں سے بہت کچھ متاثر ہو چکے ہیں مگر مذہب یا عقیدۂ خدا کا وجود انکے یہاں بھی نہیں پایا جاتا، جزایر فلپائن میں جن سیاحوں کے جانے کا اتفاق ہوا ہے ان کو معلوم ہے کہ وہاں کے قدیم باشندے بھی کوئی مذہب نہیں رکھتے۔ الغرض تمام وحشی قومیں جو دوسری قوموں کی تہذیب سے متاثر نہیں ہوئی ہیں اب بھی خدا یا مذہب کی قایل نہیں ہیں اور اگر کسی قوم میں یہ خیال پیدا ہوا ہے تو وہ صرف دوسری قوموں سے ملنے جلنے کے بعد۔ اس لئے یہ کہنا کہ مذہب کا خیال انسانی فطرت میں داخل ہے کسی طرح قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اب رہا یہ امر کہ ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ کس کس رنگ میں یہ عقیدہ ظاہر ہوا ہے سو اس بحث میں ہم کو ہر ملک و قوم کے جغرافی ماحول کو پیش نظر رکھنا ضرور ہوگا اور بنا بران یہ بحث کسی الہامی حقیقت سے متعلق نہ ہوگی بلکہ ماحول و اسباب ظاہری کی تاریخ سے تعلق رکھے گی اور اس صورت میں مذہبی مسئلہ کوئی خدائی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ صرف تمدن کی تاریخ کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔

علماء اسلام نمبر (سالنامہ ۵۵ء) کا ایک صفحہ

الرازی، ابوبکر محمد بن زکریا۔

ولادت (رے) ۲۵۰ھ / ۸۶۴ء۔ وفات (رے) ۳۱۳ھ / ۹۲۵ء

مشہور طبیب، ریاضی داں، فیلسوف، ہیئت داں اور ماہر علم الکیمیا۔ اس کے حالات زندگی بہت تاریکی میں ہیں اس نے ریاضی، فلسفہ، ہیئت و ادبیات کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا اور عمر میں پختگی پیدا ہونے کے بعد طب کی طرف توجہ کی۔ پہلے رے اور پھر بغداد کے شفاخانوں کا مہتمم ہو گیا۔ اس کے طبیب حاذق ہونے کی شہرت تمام ممالک میں پھیل گئی تھی لیکن امراء کے تلون طبع اور اس عہد کی گھڑی گھڑی بدلتے رہنے والی سیاسی فضا سے وہ ایک جگہ جم کر نہ رہ سکا اور بار بار اسے اپنے وطن واپس آنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے فن طب، علی بن ربان الطبری سے حاصل کیا تھا لیکن یہ بیان صحیح نہیں ہے، فلسفہ کی تعلیم اس نے حسب بیان ابن ندیم و ناصر خسرو، بلخ کے کسی شخص سے پائی تھی۔ اس کے شاگردوں کا حال نہیں معلوم، لیکن یہ یقینی ہے کہ اسوقت کا فلسفہ اسکے خیالات سے بہت متاثر تھا اور خصوصیت کے ساتھ شیعی حلقہ میں اس کا اثر بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ ابو اسحاق ابراہیم بن نوبخت نے جو اثنا عشری فقیہ تھا، اپنی تصنیف الیاقوت میں اس سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ فارابی، ابن ہیثم اور علی بن رضوان نے البتہ اس کے بعض نظریوں سے اختلاف کیا ہے۔

فنِ طب میں وہ بڑی زبردست شخصیت واہلیت رکھتا تھا۔ اس فن پر اس نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے زیادہ مشہور "کتاب الجدری والحصبہ" (چیچک وخسرہ) ہے اس کا سب سے بڑا علمی کارنامہ اس کی تصنیف حاوی (طب کی انسائکلوپیڈیا) ہے۔ جس کی تالیف میں اس نے پندرہ سال صرف کئے اور پھر بھی پورا نہ کر سکا۔ اس میں اس نے عرب و یونانی اطباء کے تجربات کے ساتھ خود اپنے ذاتی تجربات بھی قلمبند کئے ہیں۔ طب کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی کتابوں میں بھی زیادہ تر اپنے ہی تجربات پر بھروسہ کیا ہے اور دوسرے حکماء کے اقوال پر بھروسہ نہیں کیا۔ طبیعیات، ریاضی، ہیئت وغیرہ پر اس نے متعدد کتابیں لکھیں جن سب کی سب ضایع ہو گئیں صرف "علم الحیل والحرکات" (Mechanics) پر اس کی کتاب "میزان طبیعی" کا خلاصہ ہم تک پہونچا ہے "مابعد الطبیعیات" پر اس نے جو کچھ لکھا اس کا بھی بہت تھوڑا حصہ باقی رہا جس کا ذکر البیرونی نے کیا ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ پانچ چیزوں کو قدیم تسلیم کرتا تھا (خالق، روح، مادہ، وقت اور فضا) کیونکہ خدا کے تصور کے ساتھ ان چیزوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔ طبیعیات میں وہ افلاطون، سقراط کے نظریوں کو صحیح سمجھتا تھا اور متکلمین کا مخالف تھا۔ تخلیق کے باب میں وہ اس بات کا قایل تھا کہ کائنات (ہیولی مطلقہ) کی تخلیق سے قبل منتشر اجزاء لایعنی (Chaos) پائے جاتے تھے اور انھیں اجزاء سے بعد کو زمین، ہوا، پانی، آگ اور سیارے وجود میں آئے۔ اخلاقیات میں وہ ترک دنیا کا قایل نہ تھا۔ مذہبیات میں اس معتزلہ کی بھی مخالفت کی ہے اور غالی شیعوں کی بھی۔ اس کے دہریہ و ملحد ہونے کے ثبوت میں اس کی دو کتابیں پیش کی جاتی ہیں:۔ محارق الانبیاء۔ نقد الادیان یا محض قصے کہانیاں۔ (۴) دنیا جنگ کا فساد کا باعث صرف مذہب ہے۔ (۵) عقل و مذہب میں تطابق ممکن نہیں۔ (۶) الہامی کتابوں سے زیادہ انسانی خدمت افلاطون، ارسطو، اقلیدس اور بقراط نے کی ہے۔ (حوالجات:۔ فہرست (ابن ندیم) تاریخ حکماء (قفطی) ابن خلکان)

اقتباسات و معلومات

انسان کے عضلات میں جس سرعت کے ساتھ جنبش کی قوت موجود ہے، اس کا حال ایک جرمن مصنف کی کتاب "Life of mankind" سے معلوم ہوتا ہے، اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ وائلن (انگریزی سارنگی) بجانے والا جب انتہائے کمال کو پہونچ جاتا ہے تو ہر منٹ میں ۶۰۰ مرتبہ اس کی انگلی کو جنبش ہوتی ہے یعنی ایک سکنڈ میں دس مرتبہ۔
اسی طرح ایک ماہر پیانو نواز کو ایک سکنڈ میں ۴۰ مرتبہ انگلی کو جنبش دینی پڑتی ہے اور بعض باکمال حضرات صرف ۴۰ سکنڈ کے اندر ان جنبشوں کو پورا کر لیتے ہیں۔
زبان کے عضلات بہت زیادہ نازک اور لچیلے ہیں کہ وہ سکنڈ میں ۲۵ یا ہر منٹ میں ۱۵۰۰ مرتبہ حرکت کر سکتے ہیں۔ لیکن کس قدر حیرتناک امر ہے کہ انسان باوجود اس قدر مکمل ہونے کے اس مسئلہ میں پھر بھی مکھی سے کمتر درجہ پر ہے جو ایک سکنڈ میں ۳۳۰ مرتبہ اپنے پروں کو جنبش میں لاتی ہے۔

ٹرانسوال میں قلم لگانے کا ایک عجیب و غریب تجربہ عمل میں آیا ہے، وہاں ایک لیمو کے درخت کی شاخیں کاٹ ڈالی گئیں اور صرف تین ڈالیاں باقی رہنے دی گئیں۔ ان میں سے ایک شاخ میں نارنگی کا قلم لگایا گیا۔ دوسری شاخ میں انگور کا اور تیسری اپنے حال پر چھوڑ دی گئی۔
اس سال اس درخت میں نارنگیاں بھی آئی ہیں، انگور بھی پھلے اور چند لیمو بھی ابتدائی فصل میں پہلے نارنگی اور لیمو اس سے حاصل ہوئے اور پھر انگور۔ اور اب ہر شاخ میں جدا گانہ پھول ہر پھل کے پھر نظر آ رہے ہیں

مغرب میں ڈاکٹروں کو سخت ممانعت ہے کہ وہ اپنے کو مقبول بنانے کے لئے کسی قسم کا اشتہار دیں اور یہ سختی جس حد تک بڑھی ہوئی ہے اس کا حال ایک مثال سے معلوم ہو سکتا ہے کہ سر ولیم وھیلر نے اپنے ایک مضمون میں جو ہڈیوں کے ٹوٹنے کے متعلق فن کے نقطۂ نظر سے نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہے، اس وقت کی ایک تصویر بھی دی ہے جب کولے کی ہڈی ٹوٹنے پر پلاسٹر چڑھایا جاتا ہے، اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ ایک مریض پر ڈاکٹر کس طرح پلاسٹر کا استعمال کر رہا ہے، لیکن تصویر میں ڈاکٹر کا چہرہ صرف اس لئے اڑا دیا گیا کہ کہیں تصویر اس ڈاکٹر کی طرف سے اشتہار کے ذیل میں نہ شمار کر لیجائے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قوی حافظہ کے لوگ بہت ذہین ہوتے ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور حقیقت اس کے خلاف ہے، فی الحقیقت ذہین وہی شخص ہوگا جس کا حافظہ کمزور ہو اور قوی حافظہ ذہین ہونے کے ایک حد تک منافی ہے چنانچہ تم دیکھو گے کہ جانور بعض پیچیدہ راستوں کو بھی اپنے ذہن میں محفوظ رکھ کر اپنے مقام پر پہونچ جاتے ہیں لیکن انسان انھیں بھول جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اگر انسانی دماغ تمام ان باتوں کو یاد رکھے جو نگاہوں سے گزرتی ہیں تو اس کا ذہن مشوش ہو جائے اور سوچنے کی قوت ضعیف۔ چنانچہ نپولین کہا کرتا تھا کہ "وہ لوگ جن کا حافظہ بہت قوی ہے اور جو ہر بات کو

یاد رکھتے ہیں اس قابل نہیں ہوتے کہ افسر بنائے جائیں خواہ وہ کتنے ہی بہادر کیوں نہ ہوں"

ایک انگریزی عالم جالٹون کا قول ہے کہ اکثر و بیشتر علما ضعیف حافظہ کے ہوتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد نہیں رکھ سکتے کیونکہ حقایق صغیرہ کا علم حقایق کبیرہ پر غور کرنے سے باز رکھتا ہے۔

پیرس میں ایک شخص روزانہ ایک راستہ سے گزرتا تھا اور وہاں ایک فقیر کو موجود پاتا تھا جو اس کو دیکھ کر اپنا کشکول آگے بڑھا دیتا تھا، یہ روزانہ اس فقیر کو چار سکے دیا کرتا تھا، ایک زمانہ اسی طرح گزر گیا۔ ایک دن اس نے بجائے اس کے دوسرے فقیر کو دیکھا اور اس شخص نے اس کو بھی اسی طرح چار سکے دئے۔ اور برابر دیتا رہا۔ ایک دن اس کے نام عدالت کا سمن آیا کہ دو شخصوں نے اسے ایک معاملہ میں شاہد بنایا ہے۔ چنانچہ یہ گیا اور دیکھا کہ عدالت گاہ میں وہی دونوں فقیر موجود ہیں اور نزاع یہ ہے کہ دوسرا فقیر پہلے سے اپنے خسارہ کا مطالبہ کرتا ہے، کیونکہ پہلے فقیر نے یہ بیان کر کے کہ فلاں شخص روزانہ دس سکے دیتا ہے اس شخص کو ایک معقول رقم پر بیچ دیا تھا لیکن جب تجربہ سے معلوم ہوا کہ وہ روزانہ صرف چار سکے دیتا ہے تو اس نے اپنے خسارہ کا دعویٰ کر دیا

آنکھ اور نگاہ کے اثرات عہد قدیم سے تسلیم ہوتے چلے آرہے ہیں اور عہد حاضر میں بھی ہپناٹزم، مسمریزم وغیرہ اسی اثر نگاہ کے مختلف مظاہر ہیں۔ چنانچہ اس اثر کو علمی طور پر ثابت کرنے کے لئے انگلستان کے ایک ڈاکٹر نے نہایت نازک آلہ ایسا ایجاد کیا ہے جو نگاہ کے اثر کو فوراً بتا دیتا ہے، اس آلہ میں ایک سوئی لگی ہوئی ہے جو نگاہ پڑتے ہی جنبش میں آجاتی ہے اور جیسی نگاہ جس قدر قوی ہوتی ہے اتنے ہی زیادہ نمبر تک یہ سوئی پہونچ جاتی ہے لیکن جن کی نگاہ بہت ضعیف ہے اُن کے دیکھنے سے سوئی میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوتی۔

یہ زمانہ ہے طبیعیات و کیمیا کی ترقی کا اور یوروپ کا ارتقاء اسی ذوق کا ممنون ہے، لیکن ہندوستان میں اس کا شوق اساتذہ کے اندر بھی نہیں پایا جاتا، چہ جائیکہ طلبہ، مغرب میں شروع ہی سے بچوں کو اس طرف مائل کیا جاتا ہے اور گھروں میں مختلف تجربے طبیعیات و کیمیا کے تماشہ کی طرح ان کو دکھائے جاتے ہیں تاکہ اُن میں ابتدا ہی سے استعداد اور تفتیش و جستجو کی عادت پیدا ہو، چند مجربات ملاحظہ ہوں:

(۱) جلتی ہوئی شمع کے پاس بجھی ہوئی شمع رکھ کر اس کے فتیلہ پر فاسفورس کا ایک ذرا سا ٹکڑا رکھدو اور ان دونوں پر بارود بھر کر ٹپنچہ کا فیر کرو تو جلتی ہوئی شمع بجھ جائے گی اور بجھی ہوئی جل جائے گی۔

(۲) گندھک کا سفوف ۱۵ کیلو گرام اور برادۂ آہن بھی اسی قدر لیکر خوب پانی میں گوندھا جائے اور زمین کے اندر ۶۰ سنٹی میٹر گہرائی کر کے دفن کر دیا جائے تو چند گھنٹے نہ گزریں گے کہ بالکل کوہ آتش فشاں کا منظر سامنے آجائے گا۔

(۳) ۲۰ قطرے عامض کبریت (سلفوریک ایسڈ) کے ۲۰ گرام نائٹرک ایسڈ میں ملا کر اس کو ٹربنتھنا السنس (Turbinthina Essence) پر ڈالو گے تو فوراً اشتعال پیدا ہوگا۔

(۴) مرجھائے ہوئے پھولوں کو گرم جوش کھانے والے پانی میں ڈال دو، تو جوں جوں پانی ٹھنڈا ہوتا جائے گا۔ مرجھائے ہوئے پھول اپنی اصلی تازہ حالت پر پہونچتے جائیں گے۔

کیا خبر تھی

فضا ابن فیضی اعظمی :-

کیا خبر تھی کہ رات آئے گی
زہرِ غم اپنے ساتھ لائے گی

ہر سحر ہوگی نور کا مدفن
ہضم کرلے گا مہر و مہ کو گہن
چاندنی کا گلہ کریں گے نجوم
مہر پر ہوگا ظلمتوں کا ہجوم
طور و فاراں پہ زہر برسیں گے
روشنی کو چراغ ترسیں گے
گلشنوں پر ہنسیں گے ویرانے
مسکرائیں گے اب بلاخانے
کروٹیں لے گا موت کا کہرام
زہر پی لے گی نزہتِ ایام
لَے نشیمن کی ٹوٹ جائے گی
برق تنکوں میں گنگنائے گی
جلوہ آشوب ہوگی بزمِ سحر
موت لہرائے گی شگوفوں پہ
چاند کجلا کے ڈوب جائے گا
راگ تاریکیوں کا گائے گا،
سیپ کو اپنے چھوڑ دینگے گہر
ناگ بن کر ڈسیں گے تاج و کمر
عصمتیں دیں گی قحبگی کو رواج
لیں گے چنگیز معبدوں سے خراج
ختم ہوگی نہ قہرسامانی
ناخدا پر ہنسے گی طغیانی
لوٹ لیں گے متاعِ اہلِ یقیں
نارسیدہ حقیقتوں کے امیں
صبح کھائے گی دھوپ کی قسمیں
چاندنی ہوگی رات کے بس میں

کیا خبر تھی کہ رات آئے گی
زہرِ غم اپنے ساتھ لائے گی

سعید رزمی :-

سلب اک نگہ میں بس طاقتِ تماشا تھی
آتشیں نظر اُس کی برق صد تمنا تھی
شورشِ جنوں میری نازشِ خرد ٹھہری
ہر ادائے بدمستی عشرتِ تمنا تھی
میکدہ ترا ساقی کعبہ پرستش تھا
ذرّہ ذرّہ سے پیدا اک جبین سجدہ تھی
تابشیں تجلّی کی دوڑتی تھیں رگ رگ میں
وسعتِ حریمِ دل محشرِ تجلّا تھی
نزہتِ سحر میں بھی تھیں اُداسیاں پنہاں
قلب اگر فسردہ تھا صبح بھی فسردہ تھی

تھی ازل سے مستولی، بیخودی و سرشاری
طبع مست اے رزمی بے نیاز صہبا تھی

رازِ مسرّت

محمود اسرائیلی :-

رموزِ فطرتِ انساں کو بحرِ بیکراں پایا
ابھی آنکھوں نے کیا دیکھا ابھی ساحل کہاں پایا

بہت میخانۂ عالم میں کی پیمانہ گردانی،
کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو خوں چکاں پایا

مثالِ گل جسے دیکھا بظاہر شادماں ہم نے
دلِ صد چاک میں اس کے بھی اک زخمِ نہاں پایا

غرض ہر ہستیِ عالم پہ تھا اک کیفِ غم طاری
یہی دیکھا جہاں دیکھا یہی پایا جہاں پایا

مگر ممکن ہے اس تاویل میں ہو کچھ خطا اپنی
نہ ہو راحت کے معنی سے طبیعت آشنا اپنی

نہ ہو احساس راحت کا تو راحت اسکو کیوں کہئے
غم واندوہ کہئے یا اسے سوزِ دروں کہئے

سکونِ دل اگر حاصل نہ ہو دولت کمانے سے
تو اس سودے کو سر میں ایک اندازِ جنوں کہئے

خمارِ بادۂ اُلفت اگر پستی میں لے جائے
تو اس کو ساغرِ دل میں تمناؤں کا خوں کہئے

تبسم عارضی ہے گر لبِ غنچہ پہ تو اس کو
طلسمِ فصلِ گل کہئے گلستاں کا فسوں کہئے

مسرت وہ ہے جس سے ہو حیاتِ جاوداں پیدا
نہ ہو کلفت کی آمیزش : ہو غم کا فشاں پیدا

مُبارک ہے وہ کیفیت جو دل کو شادماں رکھے
مُبارک ہے وہ خاموشی جو انداز بیاں رکھے

غنیمت ہے وہ جذبہ جو بنا دے محو انساں کو
نہ اس کو مضطرب رکھے نہ سرگرمِ فغاں رکھے

ہے اچھا وہ تصور جو صبا کی طرح آ آکر
ریاضِ آرزو کی قلب میں رنگنیاں رکھے

ہے بہتر وہ شرارِ شوق جو اوقاتِ حرماں میں
چراغِ جستجو گوشہ میں دل کے ضوفشاں رکھے

وہ خندہ خوب جس سے غنچۂ امید کھل جائے
وہ گریہ خوب جس سے گوہرِ مقصود مل جائے

وارداتِ قلب

حامد اللہ افسر (میرٹھی)

آغاز ہوا ہے اُلفت کا انجام دیکھئے کیا ہوتا ہے
یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رونا ہے

شاید تھا بیاضِ شب میں کہیں اکسیر کا نسخہ بھی کوئی
اے صبح یہ تیری جھولی ہے یا دنیا بھر کا سونا ہے

تم پھول سمجھتے ہو جن کو وہ میرے پیارے ساتھی ہیں
تم دوب بتاتے ہو جس کو وہ میرا نرم بچھونا ہے

تدبیر کے ہاتھوں سے گویا تقدیر کا پردہ اُٹھتا ہے
یا کچھ بھی نہیں یا سب کچھ ہے یا مٹی ہے یا سونا ہے

ٹوٹے جو یہ بندِ حیات کہیں اس شور و شر سے نجات ملے
مانا کہ وہ دُنیا ہے، افسر صرف ایک لحد کا کونا ہے

فراق گورکھپوری :-

نہیں کسی کو مرے درد کی خبر نہ سہی
ہر ایک سینے میں دکھتا ہوا جگر نہ سہی

ذرا اُٹھ اے نگہِ شرمگیں ترے صدقے
کوئی کھٹک سہی رگ رگ میں نیشتر نہ سہی

ہمارے چاک گریباں میں ایک عالم ہے
وہ شانِ چاک گریبانیِ سحر نہ سہی

شبِ غم آپ کے دیوانے کاٹ ہی دیں گے
طویل ہی سہی وہ رات مختصر نہ سہی

وہ دیکھ لیتی ہے پردوں میں سب کچھ اے ناداں
نگاہِ شوق حقیقت کی پردہ در نہ سہی

فراق اُن کے بھلائے ہوئے بھی جیتے ہیں
ہمیں کو دیکھ کہ ہیں گو اُنھیں خبر نہ سہی

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذباتی نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور لیسیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے۔

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے اُن کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے، اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوش خط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفہ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ۔

(۲) مائدین کا مذہب۔ نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و ننگ نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک بڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے۔ جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزلگوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگا رنگ رقاب کی فارسی غزلگوئی پر تبصرہ، ادبیات اور اصول نقد فنون لطیفہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD. N.A 466

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی۔ دوبارہ شائع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری، مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرّیں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہئے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۰ء

نگار کی ۴۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں ۱۹۲۲ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات و انتقادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعراء کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں۔ اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران بعد عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاست کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور ان کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ جاننے کے لئے اس کا مطالعہ ازبس ضروری ہے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آ سکے تھے۔ اس نمبر میں نظام رامپور، نیاز حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عاشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرمانروایانِ اسلام نمبر) تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل ایک تاریخی کتاب ہے جو ہر گھر پڑھنے کے پاس ہونا چاہئے قیمت تین روپیہ علاوہ محصول